انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان

ماہنامہ

جریدہ حیاتِ نو

مدیر مسئول: سید راشد حامدی —— مدیر: ابوالاعلیٰ سید سبحانی

جلد:۱، شمارہ:۸، اکتوبر ۲۰۱۶ء/ذوالحجہ۔محرم الحرام ۳۸۔۱۴۳۷ھ

مجلس ادارت

محمد اسماعیل فلاحی............نئی دہلی

زبیر ملک فلاحی............لکھنؤ

انیس احمد فلاحی............جامعۃ الفلاح

فی شمارہ : اندرون ملک ۳۰/روپے
بیرون ملک ۵/امریکی ڈالر

سالانہ زرتعاون: اندرون ملک ۳۰۰/روپے
بیرون ملک ۲۰/امریکی ڈالر

لائف ممبرشپ : اندرون ملک ۳۰۰۰/روپے
بیرون ملک ۲۰۰/امریکی ڈالر

- رجسٹرڈ ڈاک سے رسالہ منگانے کی صورت میں رجسٹری خرچ بذمہ خریدار ہوگا۔
- مقالہ نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

Printed, Published & Owned by Sayyed Rashid Ali,F-9, Zeeshan Apartment, 1st Floor, Near Masjid Al-Habeeb, 40 FT Road, Shaheen Bagh, Jamia Nagar, Okhla, New Delhi-110025. **Printed at**: Ala Printing Press, 3636, Katra Dina Baig, Lal Kuan, Delhi-110006. **Published at**:F-9, Zeeshan Apartment, 1st Floor, Near Masjid Al-Habeeb, 40 FT Road, Shaheen Bagh, Jamia Nagar, Okhla, New Delhi-110025. **Editor: Abul Aala Sayyed**

نقوشِ حیات

اداریہ	ابوالاعلی سید سبحانی	۳
ہفتہ وار الہلال اور اس کی عصری معنویت	ڈاکٹر عبیداللہ فہد فلاحی	5
ہمارے زمانے کا جامعہ	ڈاکٹر عبدالقوی فلاحی	۲۵
خطبۂ مدراس: چار نکاتی لائحہ عمل (۴/۴)	نسیم احمد غازی فلاحی، رضوان احمد فلاحی، زبیر ملک فلاحی، قاسم سید، عبدالقوی فلاحی، محی الدین غازی، سید مطیع الرحمٰن حنیف فلاحی، اشتیاق عالم فلاحی، دانش ریاض	۳۵ تا 59
اردو تراجم قرآن پر ایک نظر (۱۷)	ڈاکٹر محی الدین غازی	۶۰
شوکت کریمی کی اطفالی شاعری کی تخلیقی بنیادیں	سید راشد حامدی	٦٧
مولانا جلیل احسن ندویؒ	ماسٹر عبدالجلیل مرحوم	۷۱
تاریخ جامعۃ الفلاح	ظفر احمد الاثری	۷۵
نایاب خطوط	ادارہ	۸۰
شعر ونغمہ	تنویر آفاقی، عبدالقوی عادل	۸۳
تعارف وتبصرہ	سعید اختر اعظمی	۸۵
آپ کے خطوط	قارئین	۸۷
جامعہ کے لیل ونہار	مصباح الباری فلاحی	۸۹
اخبار انجمن	ادارہ	۹۳

خط وکتابت وارسال زر کا پتہ

Zeeshan Apartment, F-9, 1st Floor, Near Masjid Al-Habeeb, 40 FT Road, Shaheen Bagh, Jamia Nagar, Okhla, New Delhi-110025

Email: jareedahayatenau@gmail.com

موبائل نمبر (مدیر مسئول): +91-9811126467

موبائل نمبر (مدیر): +91-9891051676

اپنی بات

اسلام دین ابدی بھی ہے اور دین آفاقی بھی، آپؐ کے بعد اب کوئی نبی نہیں آنے والا ہے۔ قرآن اللہ کا آخری پیغام ہے، رہتی دنیا تک انسانوں کی رہنمائی اور بھلائی کا سامان اس کے اندر موجود ہے۔ بعثت رسولؐ جزیرۂ عرب میں ہوئی، اور پھر یورپ، چین، ہندوستان اور افریقہ تک اسلام کی اشاعت ہوئی، اور آج دنیا کے کونے کونے میں اسلام کے نام لیوا پائے جاتے ہیں۔ جہاں جہاں اسلام پہنچا، ہر جگہ کے حالات یکساں نہیں تھے، حالات اور وہاں کی تہذیب وتمدن میں کافی فرق پایا جاتا تھا، لہٰذا یہ تو ممکن نہ تھا کہ تمام جزوی وفروعی مسائل میں وہ ایک رائے رکھتے، جبکہ شریعت میں کافی گنجائش موجود ہے۔ اس طرح عہد صحابہ اور اس کے بعد اجتہادات اور ان کی بنیاد پر آراء کے ختلاف کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے، وہ ہے احکام شرعیہ کے استنباط میں اختلاف، اس کے مختلف اسباب میں ایک سبب بدلتے حالات اور بدلتا زمانہ بھی ہے۔ جیسے جیسے زمانہ آگے بڑھتا گیا، اسلام دور دراز تک پھیلتا گیا، ویسے ویسے مسائل جنم لیتے رہے، ان میں وہ مسائل بھی تھے جن کا حکم براہ راست قرآن وسنت میں موجود نہیں تھا۔ لہٰذا اہل علم وفقہ نے قرآن وسنت کی روشنی میں غور وفکر اور اجتہاد کے ذریعے ان مسائل کے سلسلے میں احکام شرعیہ کا استنباط شروع کیا۔ اختلاف یقینی تھا۔ تبع تابعین کے دور میں باقاعدہ کچھ اہل علم وفقہ نے احکام شرعیہ کی جمع وتدوین کا کام انجام دیا، جن میں امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ کی خدمات نے سب سے زیادہ مقبولیت حاصل کی، اور ان کے متبعین کا ایک بڑا گروہ بھی وجود میں آ گیا، جو ابھی تک دنیا میں موجود اور تابندہ ہے، جنہیں فقہ حنفی، شافعی، حنبلی، اور مالکی کے نام سے جانا جاتا ہے۔

ان فقہاء کرام کے درمیان بھی مختلف قسم کے اختلاف پائے جاتے ہیں، جن میں ایک بڑی تعداد ان اختلافات کی ہے، جو تہذیب وتمدن اور عرف کی تبدیلی کے سبب پیدا ہوئے، وہ جہاں رہے اپنے عرف وحالات کے مطابق فتوے دیتے رہے، امام شافعیؒ کے فتوے مصر اور عراق میں الگ الگ رہے، جو آج بھی فقہ قدیم وفقہ جدید کے نام سے موجود ہیں، لیکن چونکہ یہ اختلاف ذہن وعقل کے اختلاف تھے، اس لیے ان اختلافات نے ان فقہاء کو آپس میں ایک دوسرے کے خلاف برسر پیکار نہیں کیا، امام شافعی نے امام ابوحنیفہ کے مقبرے پر نماز فجر ادا کی تو قنوت نہیں پڑھی، اور فرمایا: بسا اوقات ہم اہل عراق کے مسلک پر بھی عمل کر لیتے ہیں، شاہ ولی اللہ دہلوی نے اپنی کتاب الانصاف فی بیان اسباب الاختلاف میں اس سلسلے کے

متعدد واقعات ذکر کیے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اہل علم وفقہ آپس میں کس درجہ کشادہ ظرف تھے۔

تدوین فقہ کے بعد کبھی ایسا وقت امت نے نہیں دیکھا جب مکمل طور سے وہ جمود کا شکار ہوگئی ہو، ہر دور اور ہر زمانہ میں ایسے اہل علم وفقہ پیدا ہوتے رہے، جنہوں نے حالات کو سمجھا، ان حالات میں درپیش مسائل اور چیلنجز کا مطالعہ کیا اور پھر قرآن وسنت کی روشنی میں ان مسائل کا حل تلاش کیا، الغرض امت کبھی ابن تیمیہ، ابن القیم، شاطبی، شوکانی، شاہ ولی اللہ دہلوی اور فراہی سے محروم نہیں رہی، قرآن پر غور وفکر ہوا، احادیث کا مطالعہ ہوا، فقہ پر نئی نئی کتابیں سامنے آئیں۔

یہ ہر دور کے اہل علم کی ذمہ داری ہے کہ وہ حالات اور زمانہ کا مطالعہ کریں، اور پھر قرآن وسنت کی روشنی میں امت کی رہنمائی کریں۔ اس وقت دنیا بھر میں بسنے والی مسلم اقلیتیں طرح طرح کے مسائل اور آزمائشوں سے دوچار ہیں، ان مسلم اقلیتوں کے مسائل کیا وہی ہیں جو ان مسلمانوں کے مسائل تھے جو کبھی غالب اور حکمراں تھے، یا جو موجودہ دور میں اپنے ممالک میں دادعیش دے رہے ہیں، کیا ہندوستانی مسلمانوں کے موجودہ مسائل وہی ہیں جو اس وقت تھے جبکہ ہندوستان میں مسلمان برسر اقتدار تھے، اور کیا آج ہندوستان اور ممالک عربیہ کے مسائل ایک ہی ہیں، اگر نہیں اور یقیناً نہیں، تو کیا اہل علم وفقہ کی یہ ذمہ داری نہیں ہوتی کہ وہ ان جدید مسائل پر غور وفکر کریں اور ذہن وعقل کے اختلاف کے باوجود ان مسائل کے بہتر سے بہتر حل کی کوشش کریں۔ البتہ وہ کون افراد ہوں گے جو اس کام کو کریں گے، کیا ہر کوئی انفرادی طور پر اپنی اپنی آراء رکھے، یا کہ پھر ان پر اجتماعی طور سے غور وفکر کی ضرورت ہے، ظاہر سی بات ہے وہ مسائل جو عمومی نوعیت کے ہیں ان کا حل انفرادی کوششوں سے زیادہ اجتماعی کوششوں کا طالب ہے۔ اس میں جو سب سے بڑی دشواری پیش آتی ہے، وہ یہ کہ ہر کوئی اپنا موقف متعین کرنے لگتا ہے، اس میں ہونا یہ چاہیے کہ مسئلہ پر انفرادی سطح پر غور وفکر کیا جائے، اس پر ایک رائے قائم کی جائے، پھر دیگر آراء جب پیش ہوں تو اپنی رائے بھی پیش کی جائے، اور پھر اجتماعی غور وفکر کے بعد دلائل کی بنیاد پر ایک مشترکہ موقف اختیار کیا جائے، اس سے ایک فائدہ تو یہ ہوگا کہ اس نفسیات کی اصلاح ہو جائے گی کہ میرا جو موقف ہے وہی ٹھیک ہے اور دیگر موقف غلط ہیں، دوسرا یہ عمل عصر حاضر میں دعوت اسلامی کے اس عظیم کاز کو تقویت پہنچائے گا، جو ایک عرصہ سے مسلم امت کے داخلی مسائل کا شکار بنا ہوا ہے۔

جدید مسائل پر غور وفکر کرتے ہوئے ایک چیز اور دھیان میں رکھنے کی ضرورت ہے کہ اسلامی شریعت کے کچھ امتیازات ہیں، کچھ چیزیں اصول کا درجہ رکھتی ہیں اور کچھ عقائد کا، ان سے دستبرداری کسی صورت جائز نہیں ہے، جب بھی جدید مسائل پر گفتگو ہو تو اس بات کو پیش نظر رکھ کر بات کی جانی چاہیے۔ اس بات پر بھی زور دینا مناسب ہوگا کہ امت اسلامیہ کو کس طرح معاشی، سماجی، سیاسی اور دیگر محاذوں پر مضبوط کیا جائے کہ شریعت سے بھی ہاتھ نہ چھوٹے، ایمان وعقیدہ بھی سلامت رہیں اور مطلوبہ مقاصد بھی حاصل ہو جائیں۔

ابوالاعلی سید سبحانی

ہفتہ وار الہلال اور اس کی عصری معنویت

ڈاکٹر عبیداللہ فہد فلاحی، پروفیسر شعبہ اسلامک اسٹڈیز علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

موبائل نمبر:9997605069

غلبہ وحریت کا مژدہ

مولانا ابوالکلام آزاد (۱۸۸۸ء۔۱۹۵۸ء) ایک جری اور بیباک صحافی، صاحب اسلوب ادیب اور نثر نگار، مفکر و متکلم اسلام، مفسر قرآن اور تحریک آزادئ ہند کے قائد تھے۔۱۳ / جولائی ۱۹۱۲ء کو ہفتہ روزہ مصور رسالہ الہلال کا پہلا شمارہ الہلال الیکٹریکل پرنٹنگ ورکس نمبر ۷۔۱، میکلا وڈ اسٹریٹ کلکتہ سے شائع ہوا تو اس کے سرورق پر مدیر مسئول ومحرر خصوصی کی حیثیت سے احمد المکنی بأ بی الکلام الدھلوی کا نام درج تھا۔اوپر قرآن کریم کی یہ آیت بحیثیت نصب العین رقم تھی۔یہ قرآنی مژدۂ جاں فزا کا اعلان بھی تھا اور ہندوستانی مسلمانوں کے لیے واضح لائحہ عمل بھی:

وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ۔(۱)

اور نیچے سورۃ الحج کی آیت ۷۸ / درج تھی:

وَجَاهِدُوا فِي اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِ هُوَ اجْتَبَاكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ مِّلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِينَ مِن قَبْلُ وَفِي هَذَا لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيداً عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا شُهَدَاء عَلَى النَّاسِ فَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَاعْتَصِمُوا بِاللَّهِ هُوَ مَوْلَاكُمْ فَنِعْمَ الْمَوْلَى وَنِعْمَ النَّصِيرُ۔

(اور اللہ کی راہ میں جہاد کرو، جو حق جہاد کرنے کا ہے۔اس نے تم کو تمام دنیا کی قوموں میں برگزیدگی اور امتیاز کے لیے چن لیا۔پھر جو دین تم کو دیا گیا ہے، وہ ایک ایسی شریعت فطری ہے جس میں تمہارے لیے کوئی رکاوٹ نہیں۔یہی ملت تمہارے مورث اعلیٰ ابراہیم خلیل کی ہے، اور اس نے تمہارا نام ''مسلمان'' رکھا ہے گزشتہ زمانوں میں بھی اور اب بھی۔تاکہ

رسول تمہارے لیے اور تم تمام عالم کی ہدایت ونجات کے لیے شاہد ہو۔ پس اللہ کے رشتہ کو مضبوط پکڑو، جان اور مال دونوں کو اس کی عبادت میں لٹاؤ۔ وہی تمہارا ایک آقا اور مالک ہے، اور پھر جس کا خدا مالک وحاکم ہو، اس کا کیا اچھا مالک ہے اور کیسا قوی مددگار!)

درج بالا عبارت کو ہم آیت مذکورہ کا ترجمہ قرار نہیں دے سکتے کہ مولانا آزاد نے اس میں اپنی تشریحات بھی تفہیم کے لیے داخل کردی ہیں مگر اسے آیت کی ترجمانی کہنے میں کوئی باک محسوس نہیں کرتے کہ مفہوم اور معنی سلیس اور عام فہم اسلوب میں ادا ہو گیا ہے۔

تصویروں سے اصلاحی مشن کا انعکاس

صفحۂ فہرست پر السید محمد رشید رضا (۱۸٦۵ء۔۱۹۳۵ء) کی تصویر ہے۔

صفحہ۳/ پر ایک دوسری تصویر جلوہ گر ہے۔ ان الفاظ کے تعارف کے ساتھ:

''اولین مؤسس اساس حریت وآزادی، شہید راہ اصلاح وملت پرستی۔ شیخ الاحرار، آیۃ من آیات اللہ، السید جمال الدین الافغانی أعلی اللہ مقامہ'' (۳۹/۱۸۳۸ء۔۱۸۹۷ء) (۲)

صفحہ۵/ پر ایک دوسرے مصلحِ عالم اسلام کی تصویر ان تعارفی الفاظ کے ساتھ شائع ہوئی ہے:

''الاستاذ الامام، حجۃ الاسلام، رئیس المصلحین حضرۃ الشیخ محمد عبدہ رضی اللہ تعالی عنہ'' (۱۸۴۹ء۔۱۹۰۵ء)

اگلے صفحہ پر رشید رضا کی تصویر دوبارہ موجود ہے ''محی السنۃ قامع البدعۃ حضرۃ الفاضل المصلح السید محمد رشید رضا'' کے تعارفی الفاظ کے ساتھ۔

صفحہ۱۲/ پر ایک مجاہد سپاہیانہ لباس میں ایستادہ ہے مگر اس تصویر پر تعارفی الفاظ موجود نہیں ہیں، البتہ مضمون میں اس کی صراحت اس طرح کی گئی ہے:

''ایسے ہی وطن پرست اور جاں نثارِ اسلام نوجوانوں میں غازی اور ادرنہ کا مشہور معرکہ آرا جاوید بک ہے جس کی تصویر آج اس کالم میں درج کی جاتی ہے۔ جب اٹلی کے حملہ کی خبر مشہور ہوئی تو یہ فرانس میں مختلف علوم وفنون کی تکمیل میں مصروف تھا، لیکن جنگ کے اعلان کی خبر سنتے ہی اضطرابِ دلی سے بے قرار ہوگیا۔ تمام اشغال یکسر ترک کر کے فرانس سے تیونس آیا اور وہاں سے سینکڑوں ترک وعرب افسروں کی طرح بھیس بدل کر حدود طرابلس میں صحیح وسالم داخل ہوگیا۔ آج اس کی تصویر دیکھئے تو فرانس کے کسی دار العلوم کی جگہ مدرسہ حربیہ کا تربیت یافتہ جنرل معلوم ہوتا ہے''۔ (۳)

الہلال کے اسی شمارے میں صفحہ۱۳/ پر کارزار طرابلس کی ایک اور اہم تصویر ہے جس پر درج ذیل

تعارفی عبارت موجود ہے:

''شیخ سلیمان بارونی (ضلیلہ) کے عرب مجاہدین کے ساتھ دشمن کا انتظار کررہے ہیں''۔(۴)

صفحہ۱۴ پر عثمانی کیمپ عزیزیہ کی ایک تصویر ہے۔ان تصاویر کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ الہلال کس جاہ وجلال کے ساتھ مطلع صحافت پر نمودار ہوا اور اولین شمارے سے نامورانِ غزوۂ طرابلس، افسانۂ عجم، اقصائے مغرب اور تمہید افتتاحی کے مستقل کالموں پر مضامین شائع کر کے اس نے عالم اسلام اور مسلمانوں سے اپنے گہرے تعلق کا والہانہ اظہار کیا اور آئندہ کے منصوبوں کی طرف آغاز ہی میں اشارہ کر دیا۔

اولین شمارۂ الہلال کی ''تمہید افتتاحی'' کا پہلا پیراگراف مولانا آزاد کی دیرینہ آرزو کی تکمیل کا اعلان کس تواضع، نیازمندی اور بارگاہ الٰہی میں اخبات وخشوع کے جذبہ کے ساتھ کرتا ہے، پڑھنے کے لائق ہے۔حمد وثنا کے جو ابتدائی کلمات ہیں اور ان میں آیات قرآنی کا جو انتخاب شامل ہے اس سے بھی الہلال کے مشن پر روشنی پڑتی ہے:

بحمدك اللهمّ، و نستغفرك و نستعين بك و نستهديك و نتوكل عليك و نسئلك العفو و العافية و التوفيق للعمل فيما يرضيك، و نصلى و نسلم على نبيك المصطفىٰ و حبيبك المجتبىٰ، الذى أرسلته كافةً للناس بشيراًو نذيراً (۲۸:۳۴) وداعياً الى الله باذنه و سراجاً منيراً (۴۹:۳۳) و آتيته كتابا يهدى لـلتى هى أقوم و يبشر المومنين الذين يعملون الصالحات أنّ لهم أجراً كبيراً(۸:۱۷) فيا رب أدخلنى مدخل صدق وأخرجنى مخرج صدق واجعل لى من لدنك سلطاناً نصيراً(۸:۱۷)

ان دعائیہ کلمات میں بھی فاضل مدیر کے منصوبوں اور عزائم، نصب العین اور اہداف کی جھلک نظر آتی ہے۔ وہ رب ذوالجلال سے پورے الحاح وتضرع کے ساتھ ہدایت ورحمت، مغفرت ونصرت اور رضائے الٰہی کی توفیق طلب کرتے ہیں۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں درود وسلام کی سوغات پیش کرتے ہیں تو آپ کے منصب داعی اعظم اور بشیر ونذیر کے حوالہ کے ساتھ، اور وحی ربانی کی نعمت کے نزول کے تذکرہ کی معیت میں اور اس میں بھی کتاب الٰہی کے اوصاف ہدایت وبشارت کا مژدہ دینے والی آیات کا لاحقہ لگاتے ہیں اور آخر میں اس دعا پر اپنی تمہید مکمل کرتے ہیں جو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے حبیب نے سکھائی تھی کہ ''اے پروردگار! مجھے جہاں لے جا، اور جہاں سے نکال اچھی طرح نکال۔اور میرے لیے اپنے پاس سے غلبہ اور امداد مقرر فرما دے!''

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ یہ دعائیہ آیت ہجرت کے موقع پر نازل ہوئی تھی جبکہ اللہ کے رسول صلی

اللہ علیہ وسلم کو مدینہ میں داخل ہونے اور مکہ سے نکلنے کا مسئلہ درپیش تھا۔بعض کہتے ہیں کہ آیت کے معنی ہیں کہ مجھے سچائی کے ساتھ موت دینا اور سچائی کے ساتھ قیامت والے دن اٹھانا۔بعض کہتے ہیں کہ مجھے قبر میں سچا داخل کرنا اور قیامت کے دن جب قبر سے اٹھانا تو سچائی کے ساتھ قبر سے نکالنا۔امام شوکانیؒ فرماتے ہیں کہ چونکہ یہ دعا ہے اس لیے اس کے عموم میں یہ سب باتیں آجاتی ہیں۔(۵)

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ (۱۹۰۳ء۔۱۹۷۹ء) آیت کے آخری ٹکڑے واجعل لی من لدنك سلطاناً نصیراً کی تشریح میں لکھتے ہیں کہ ''جبکہ یہ دعا اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو خود سکھائی ہے تو اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ اقامت دین اور نفاذ شریعت اور اجرائے حدود اللہ کے لیے حکومت چاہنا اور اس کے حصول کی کوشش کرنا نہ صرف جائز بلکہ مطلوب ومندوب ہے اور وہ لوگ غلطی پر ہیں جو اسے دنیا پرستی یا دنیا طلبی سے تعبیر کرتے ہیں۔دنیا پرستی اگر ہے تو یہ کہ کوئی شخص اپنے لیے حکومت کا طالب ہو۔رہا خدا کے دین کے لیے حکومت کا طالب ہونا تو یہ دنیا پرستی نہیں بلکہ خدا پرستی ہی کا عین تقاضا ہے۔اگر جہاد کے لیے تلوار کا طالب ہونا گناہ نہیں ہے تو اجرائے احکام شریعت کے لیے سیاسی اقتدار کا طالب ہونا آخر کیسے گناہ ہو جائے گا؟''(۶)

خوابوں کی تعبیر

مولانا ابوالکلام آزادؒ اپنے اولین پیراگراف میں لکھتے ہیں:

''چگونہ می بمیاں آورم دریں مجلس
کہ بادہ حوصلہ سوزست وجملہ بد مستند

۱۹۰۶ء کے موسم سرما کی آخری راتیں تھیں جب امرتسر میں میری چشم بیداری نے ایک خواب دیکھا۔انسان کے ارادوں اور منصوبوں کو جب تک ذہن وتخیل میں ہیں، عالم بیداری کا ایک خواب ہی سمجھنا چاہیے۔کامل چھ برس اس کی تعبیر کی عشق آمیز جستجو میں صرف ہوگئے۔امیدوں کی خلش اور ولولوں کی شورش نے ہمیشہ مضطرب رکھا اور یاس وقنوط کا ہجوم بارہا حوصلہ وعزم پر غالب آگیا۔لیکن الحمدللہ کہ ارادے کا استحکام اور توفیق الٰہی کا اعتماد ہر حال میں طمانیت بخش تھا۔یہاں تک کہ آج اس خواب عزیز کی تعبیر عالم وجود میں پیش نظر ہے:

هَـٰذَا تَأْوِيلُ رُؤْيَايَ مِن قَبْلُ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّي حَقًّا'' (۱۲:۱۰۰) (۷)

آگے مولانا آزاد اپنے عزائم کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

''الہلال کی اشاعت ہمارے قدیمی ارادوں کے سفر کا آغاز ہے اور فضل الٰہی سے امید

ہے کہ اب بہت جلد اپنے ارادے کے اعمال مہمہ میں مصروف ہوسکیں گے۔ ایک اردو ہفتہ وار رسالہ کی اشاعت کے لیے برقی طاقت سے چلنے والی مشینوں کی ضرورت نہ تھی اور نہ کسی وسیع پریس کے متعلقات وآلات کی۔ اور نہ ایک اردو کا ہفتہ وار اخبار ملک کی موجودہ حالت کے لحاظ سے اتنی حیثیت پیدا کرسکتا ہے کہ کسی بڑے پریس کو اپنے اعتماد پر قائم رکھ سکے۔ پھر وہ خواہ کتنے ہی وسیع پیمانے پر جاری کیا جائے لیکن کوئی ایسا مقصد زندگی نہیں ہوسکتا جس کا انتظار شب ہائے امید کی بے چینیوں اور روز ہائے تلاش کے اضطراب کا حقدار ہو، خدا کے بخشے ہوئے دل ودماغ کی یہ ناقدری وتحقیر ہے، اگر اس کے مقاصد کا سدرۃ المنتہی اس سے زیادہ بلند نہ ہوسکے۔ پس یہ جو کچھ کیا جارہا ہے، درحقیقت چند عزائم عظیمہ ہیں جن کی طرف بتدریج متوجہ ہونا ہے اور میں نہیں جانتا کہ کل کیا ہوگا؟ وماتشاؤن الا أن یشاء اللہ ان اللہ کان علیماً حکیماً۔ "(۸)

آخر میں مولانا آزاد اپنے رب سے فریاد کرتے ہیں:

''یہ آخری التجا ہے کہ اگر وہ مجھ میں سچائی اور خلوص کی کوئی سرگرمی دیکھتا ہے، اگر اس کی ملت مرحومہ اور اس کے کلمہ حق کی خدمت کی کوئی سچی تپش میرے دل میں موجود ہے، اور اگر واقعی اس کی راہ میں فدویت اور خودفروشی کی ایک آگ ہے، جس میں برسوں سے بغیر دھویں کے جل رہا ہوں تو اپنے فضل ولطف سے مجھے اتنی مہلت عطا فرمائے کہ اپنے بعض مقاصد کے نتائج اپنے سامنے دیکھ سکوں۔ لیکن اگر یہ میرے تمام کام محض ایک تجارتی کاروبار، اور ایک دوکاندارانہ شغل ہیں جس میں قومی خدمت اور ملت پرستی کے نام سے گرم بازاری پیدا کرنا چاہتا ہوں تو قبل اس کے کہ میں اپنی جگہ پر سنبھل سکوں، تو میری عمر کا خاتمہ کردے۔ اور میرے تمام کاموں کو ایک دن بلکہ ایک لمحہ کے لیے بھی کامیابی کی لذت چکھنے نہ دے۔ باغوں کے سرسبز وثمر دار درختوں کی حفاظت کی جاتی ہے، مگر جنگل کے خشک درختوں کو جلانا ہی چاہیے۔ جس دل میں خلوص اور صداقت کو جگہ نہیں ملی اس کو کامیابی کے لیے کیوں باقی رکھا جائے؟ أَمْ حَسِبَ الَّذِينَ اجْتَرَحُوا السَّيِّئَاتِ أَن نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَوَاءً مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ (۴۵:۲۱) (۹)

اس اداریہ کے آخر میں مولانا آزاد ''اعتذار'' کے ذیلی عنوان سے ترکی ٹائپ میں الہلال کی طباعت کی راہ کی دشواریوں پر گفتگو کرتے ہیں۔ کمپوزنگ عملہ کی ناتجربہ کاری کا رونا روتے ہیں اور مختلف تکنیکی دقتوں کی وجہ سے شروع کے دوصفحات ہی ترکی ٹائپ میں کمپوزنگ کی توجیہ پیش کرتے ہیں اور پھر

اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''اِن پریشانیوں کی وجہ سے نہ تو اس نمبر کو اچھی طرح ترتیب دیا جاسکا، اور نہ مضامین تقسیم ولازمی اختصار کے ساتھ آسکے، البتہ ایک سرسری اندازہ آئندہ کی نسبت کیا جاسکتا ہے۔ ہم جو کچھ کررہے ہیں اس کے لیے نہ تو قدردانی کے متوقع ہیں اور نہ خریداروں کے ہجوم کے۔ لوگ اگر خریدیں اور پڑھیں تو شکریہ، نہیں تو شکایت بھی نہیں۔

گل فشانند بہ بستر ہمہ چوں عرفی و من
مشت خس چینم و در خانۂ خواب اندازیم''(۱۰)

تلوار وقلم کا اجتماع

مولانا آزاد نے اسی شمارہ میں عثمانی مجاہد طرابلس یوزباشی جاوید بک پر ایک خاکہ شائع کیا ہے جس میں اس کی شجاعت وبسالت کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ اس مضمون کا اہم ترین حصہ وہ تمہیدی کلمات ہیں جن میں مولانا کے گہربار قلم نے اسلام کی معجزانہ صلاحیت وقابلیت کا اعتراف کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''دنیا میں تلوار اور قلم ایک ہاتھ میں کم جمع ہوتے ہیں۔ تلوار کا آہنی قبضہ شاید اس قدر سخت ہے کہ اس کی گرفت کے بعد انگلیوں میں قلم کی گرفت کی صلاحیت باقی نہیں رہتی، لیکن سرزمین اسلام کے اعجوبہ زار میں کون سی شے تعجب انگیز نہیں؟ تخت حکومت اور بوریائے درویشی، گلیم فقر اور خلعت شہنشاہی، محراب عبادت اور ایوان سلطانی، دبدبہ وسطوت اور عدل ومساوات، دولت وتجارت اور توکل وقناعت، اشتغال دلیری اور زہد وعبادت، ترقیات مادی اور تصفیۂ روحانی، اعتماد نفس وتدبیر اور تفویض واعتقاد تقدیر، غرضیکہ سینکڑوں جذبات واعمال ہمیشہ باہم مخالف چلے آتے تھے، جنہوں نے سب سے اول اس کے جامع اضداد، دورِ خصوصیت میں ایک دوسرے سے معانقہ کیا۔''

آگے مزید لکھتے ہیں:

''منجملہ ان کے ایک بہت بڑی خصوصیت یہ ہے کہ تیغ وقلم کی قدیمی مخالفت مٹا کر دونوں کو ایک جگہ جمع کردیا۔ ممکن ہے کہ دیگر اقوام میں اس کی خال خال مثال ملے، لیکن اسلام کی تاریخ اس کی سینکڑوں مثالوں سے لبریز ہے۔ اس کے دورِ عروج میں ہزاروں تصنیفات جہاں مدرسوں کے سنگی حجروں اور مسجدوں کے گردآلود صحنوں میں ترتیب دی گئی ہیں وہاں شاہی تخت وایوان کے طلائی فرش اور سپہ سالار کے دفتر جنگ میں بھی نیام کے ساتھ قلمدان نے جگہ پائی ہے''۔(۱۱)

ابن تیمیہؒ کی جلالت

مولانا آزاد نے یہاں شیخ الاسلام ابن تیمیہ (۱۲۶۳ـ۱۳۲۸ء) کی مثال پیش کی ہے جو عالم اسلام کے ممتاز مجدد و مصلح، مفکر و مصنف اور پر جوش داعیٔ اسلام تھے۔ حنبلی مسلک کے پیرو فقیہ ہونے کے باوجود ایک مجتہد، سلفی الفکر مفکر، تقلید کے مخالف اور غیر اسلامی افکار و عقائد کے دشمن تھے۔ انہوں نے قرآن وسنت کے نصوص کی طرف رجوع کرنے کی دعوت دی اور اپنی مدلل گفتگو اور مبرہن تحریروں سے علم الکلام، فلسفہ اور تصوف کے تار و پود بکھیر دیئے۔ انہوں نے امام الغزالی، محی الدین ابن العربی، عمر بن الفارض اور صوفیاء کی طرف منسوب خیالات وعقائد کی تردید کی۔ صوفی اور متکلمین کو ایک ہی کشتی کا سوار قرار دیا۔ فلسفۂ یونان اور اس کے اسلامی نمائندوں بالخصوص ابن سینا اور ابن سبعین پر زوردار حملے کیے۔ خوارج، مرجیہ، روافض، قدریہ، کرامیہ، معتزلہ، جہمیہ اور اشاعرہ سے سخت مزاحمت مول لی۔ وہ بدعات کے سخت دشمن تھے۔ انہوں نے اولیاء پرستی اور مزارات کی زیارت کی شدید مذمت کی۔ وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث مبارک سے استدلال کرتے تھے کہ ''صرف تین مسجدوں کا سفر اختیار کرو: مکہ کی مسجد حرام، بیت المقدس کی مسجد اور مسجد نبوی۔'' (۱۲) اپنی مشہور تصنیف ''الرد علی النصاری'' اور ''الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح'' میں انہوں نے یہودیت اور عیسائیت پر سخت تنقید کی اور ان کی مذہبی کتب کو تحریف شدہ ثابت کیا۔

ابن تیمیہ نے اپنی اس راسخ الاعتقادی کی وجہ سے مسلم معاشرہ کے مختلف طبقوں کی جانب سے سخت مزاحمت اور مخالفت برداشت کی۔ انہیں سیاسی طالع آزماؤں کی سازشوں کا شکار بھی بننا پڑا۔ ان کی زندگی کا قیمتی حصہ جیل کی سلاخوں کے پیچھے گزرا۔ نومبر دسمبر ۱۲۹۹ء میں صفات باری تعالی کے متعلق حماۃ سے بھیجے گئے ایک سوال کا جواب دینے پر شافعی علماء ابن تیمیہ سے ناراض ہوئے تو دمشق میں مدرس کے عہدہ سے انہیں مستعفی ہونا پڑا۔ ۱۳۰۶ء میں قاہرہ میں قاضیوں کی مجلس نے انہیں مشبّہ قرار دیا اور وہ ڈیڑھ سال تک پہاڑی قلعہ کے تہہ خانہ ''جب'' میں قید رکھے گئے۔ فرقہ اتحادیہ کے خلاف ایک رسالہ لکھنے کے جرم میں انہیں دمشق واپس کر دیا گیا اور ابھی اپنے سفر کی پہلی منزل ہی طے کی تھی کہ ابن تیمیہ کو راستے سے واپس بلا کر قاضی کے قید خانہ 'حارۃ الدیلم' میں ڈیڑھ برس کے لیے محبوس کر دیا گیا۔ اگست ۱۳۱۸ء میں انہیں حکومت نے طلاق بالیمین کے متعلق فتوی دینے سے منع کیا جس کی تعمیل نہ کرنے پر اگست ۱۳۲۰ء میں دمشق کے قلعہ میں انہیں پھر قید کر دیا گیا۔ پانچ ماہ اور اٹھارہ دن کے بعد سلطان کے حکم سے انہیں رہائی ملی۔

اولیاء کے مزارات پر حاضری دینے کے خلاف ۱۳۱۰ء میں ایک فتوی دینے کے جرم میں جولائی ۱۳۲۶ء میں سلطان کے حکم سے پھر انہیں نظر بند کر دیا گیا۔ اس بار دمشق کے قلعہ میں یہ نظر بندی ان پر

شاق گزری۔ تاہم انہوں نے تصنیف وتالیف کا کام جیل میں بھی جاری رکھا۔ دشمنوں کو اس کا علم ہوا تو انہیں کتابوں سے اور کاغذ اور روشنائی سے محروم کر دیا گیا۔ اس سے انہیں سخت صدمہ پہنچا۔ انہوں نے تلاوت اور نوافل سے تسکین حاصل کی مگر بیس دنوں کے اندر ہی ان کا انتقال ہو گیا۔ اندازہ ہے کہ ان کی نماز جنازہ میں دو لاکھ سے زائد لوگوں نے شرکت کی۔

علامہ ابن تیمیہ ایک کثیر التصانیف عالم تھے۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے پانچ سو کتابیں تصنیف کی تھیں۔ جن میں سے محمد بن شنب اور عبدالمنان عمر نے اپنے مشترکہ مقالہ میں ۱۵۹/کتب کی تفصیل فراہم کی ہے(۱۳) ابن الہادی (۱۴)، صدیق حسن خاں (۱۵) اور غلام جیلانی برق (۱۶) نے ۴۸۰/کتابوں کے نام حروف تہجی کے اعتبار سے دیے ہیں۔ ڈاکٹر ابوزہرہ نے آثار ابن تیمیہؒ کی تین بڑی قسمیں قرار دی ہیں:

۱۔ تصانیف وفتاوی ابن تیمیہ، جو علوم اسلامیہ کے تمام اہم موضوعات سے متعلق ہیں۔

۲۔ تلامذہ ابن تیمیہ بطور خاص حافظ ابن قیمؒ۔

۳۔ متبعین منہاج ابن تیمیہ جیسے شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب (۱۷)۔

مولانا رئیس احمد جعفری ندوی نے ابن تیمیہ کی ۵۹۱/کتابوں کی فہرست دی ہے، جس میں چھوٹے چھوٹے رسالے، چند اوراق کے مقالے نیز خطوط بھی شامل ہیں۔ اس فہرست کو درج ذیل عناوین میں تقسیم کیا گیا ہے:

۱۔ کتب ورسائل متعلقہ تفسیر کلام الٰہی

۲۔ کتب احادیث

۳۔ فقہ اور فتاوی وغیرہ

۴۔ کتب اصول فقہ وغیرہ

۵۔ کتب عقائد وعلم کلام

۶۔ کتب علم الاخلاق، زہد، تصوف

۷۔ فلسفہ ومنطق پر تنقید واعتراضات

۸۔ خطوط وغیرہ

۹۔ متفرق کتب۔ (۱۸)

اپنی بے پناہ علمی ودرسی مصروفیات کے باوجود، اور مختلف مسلمان فرقوں اور خود حکومت وقت کی جانب سے دشنام طرازیوں اور قید وبند کی صعوبتوں کے باوصف، ابن تیمیہؒ نے ۶۹۹ھ میں دمشق کو تاتاریوں کے حملے سے بچانے کے لیے جان کی بازی لگا دی۔ تاتاریوں کے بادشاہ قازان کے لشکر میں

علماء کا ایک گروہ لے کر حاضر ہوئے اور پوری علمی جلالت اور فقیرانہ سطوت کے ساتھ شاہ قازان کو تنبیہ کی اور اس طرح اہل دمشق نے کچھ عرصے کے لیے سکون واطمینان کا سانس لیا۔ پھر ۷۰۲ھ میں جب منگولوں کے خلاف جہاد کا وقت آیا تو شیخ الاسلام نے اپنی پر جوش تقریروں سے مسلمان فوج کو اور والیٔ مصر سلطان کو ترغیب دلائی اور انہیں آمادۂ دفاع کیا۔ دمشق کے قریب شقحب کی فتح میں وہ ایک مجاہد کی حیثیت میں خود شریک تھے۔

ابن تیمیہؒ کے اندر قلم اور تلوار کا اجتماع تاریخ اسلام کے معجزات میں سے ہے۔ اسی لیے مولانا آزاد نے ان کی شخصیت کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا:

''اسلام کی تاریخ میں فتنۂ تاتار سے بڑھ کر اور کوئی آفت نہیں آئی۔ ۷۰۲ھ میں جب قتلو خان نوے ہزار فوج کے ساتھ شام پر حملہ آور ہوا تو علامہ ابن تیمیہؒ اپنے درس وتدریس کے حجرے میں مصروف تصنیف وتالیف تھے لیکن حملے کی خبر جوں ہی شائع ہوئی قلم کی نوک توڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس کو شمشیر جہاد کے قبضے سے بدل لیا۔ سلطان ناصر سے مل کر تمام ملک میں حفظ وطن ودفاع کی تحریک چلائی اور ایک تجربہ کار افسرِ فوج کی طرح برج الصغر کے میدان میں دادشجاعت دے کر دشمنوں کو شکست دی''۔ (۱۹)

اسلام کی قوت زرخیزی

اس کے بعد مولانا آزاد حقائق کا ادراک کرنے کے ساتھ قلم وتلوار کے اجتماع کی موجودہ دور میں نایابی کا تجزیہ کرتے ہیں اور مسلمانوں کو امید کی کرن دکھاتے ہیں جو الہلال کا اصل نصب العین تھا:

''یہ سچ ہے کہ اب صدیوں سے ان اسلامی خصوصیات کی مثالیں ناپید ہیں، مگر اس کا سبب زمین کا نقص نہیں بلکہ نشو پذیر تخم کی نایابی ہے۔ انسان اپنے تمام جذبات وقویٰ کے ظہور کے لیے خارجی محرکات ومؤثرات کا محتاج ہے اور یہی طبعی احتیاج اسلام کی اصطلاح میں تقدیر اور اذن الٰہی ہے جس کے بغیر دنیا کا ایک ذرہ بھی ہل نہیں سکتا۔ اسلام پر آٹھ سو سالوں سے جو عالمگیر تنزل چھایا ہوا ہے، اس کا اصلی سبب یہ ہے کہ قوتوں کے ظہور وتحریک کے لیے سنین اولیٰ کے حالات واسباب میسر نہیں، ورنہ آج بھی اسلم کی خاک وہ لعل وجواہر اُگل سکتی ہے جن کی درخشندگی نے چشم عالم کو خیرہ کر دیا تھا''۔ (۲۰)

اس اقتباس کو بار بار پڑھیے۔ اسلام کی صلاحیت زرخیزی وشادابی پر مولانا آزاد کو کس درجہ ایمان وایقان حاصل ہے، تقدیر اور خارجی عوامل کی ہم رشتگی کی کیسی خوبصورت تعبیر ہے۔ نامرادی اور مایوسی کے دلدل سے مسلم نوجوانوں کو نکالنے کا کیسا بہترین فلسفہ اور حسین منطق ہے۔ ''انسان اپنے تمام جذبات

وقوی کے ظہور کے لیے خارجی محرکات ومؤثرات کا محتاج ہے'' اس کا اطلاق کس درجہ مہارت کے ساتھ فاضل مدیر نے عثمانی ترکوں کی بسالت پر کیا ہے۔

سید رشید رضا کا سفر لکھنؤ

ندوۃ العلماء لکھنؤ کے اجلاس سیزدہم ۱۳۳۰ھ/۱۹۱۲ء میں شرکت کے لیے سید محمد رشید رضا مصری مدیر ''المنار'' اکیس دن کی بحری مسافت طے کر کے اور شدائد سفر اور اخراجات کا بار اٹھا کر ہندوستان تشریف لائے۔ یہ اجلاس ۱۷۔۱۹ ربیع الثانی/۶۔۸ اپریل کو دارالعلوم کے زیر تعمیر ہال میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس کو سید سلیمان ندویؒ (۱۸۸۴ء۔۱۹۵۳ء) نے ''معنوی اعتبار سے ندوۃ العلماء کا سب سے کامیاب اجلاس'' قرار دیا (۲۱)۔ علامہ رشید رضا ۲۲/مارچ کو بمبئی فروکش ہوئے اور وہاں کے بڑے بڑے معززین، رؤساء اور اہل عرب نے آپ کا خیر مقدم کیا۔ چند روز کے قیام کے بعد وہ بمبئی سے دہلی کو روانہ ہوئے۔ دہلی سے لاہور تشریف لے گئے اور ۴/اپریل کو ندوۃ العلماء میں شرکت کے لیے لکھنؤ کو سرفراز کیا۔ پھر یہاں چند روز قیام کر کے مصر واپس تشریف لے گئے۔ (۲۲)

ندوۃ العلماء کے اجلاس میں سید رشید رضا نے نصاب و نظام تعلیم کی اصلاح پر زور دیا۔ مسلمانوں کے عروج و زوال کے اسباب پر روشنی ڈالی۔ مسلمانوں کو سلف کی راہ پر چلنے کی تلقین کی کیونکہ امام مالکؒ فرمایا کرتے تھے کہ ''امت محمدیہ کے متأخرین کی اصلاح اُن ہی باتوں سے ہوگی جن سے اس امت کے متقدمین کی اصلاح ہوئی تھی''۔ عربی زبان کے عالمگیر اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے انہوں نے مسلمانوں کو خطاب کیا:

> ''ہم بیمار ہیں اور ہماری دوا قرآن مجید بتائی گئی ہے جس کی نسبت دعوی کیا گیا ہے کہ وہ مسلمانوں کے لیے عین رحمت اور سراسر شفا ہے۔ جو شخص دوا کو نہیں جانتا اس کے تندرست ہونے کی کیا امید ہوسکتی ہے؟ صاف ظاہر ہے کہ اس دوا کا جاننا عربی زبان جاننے پر موقوف ہے۔ اگر اول عربی زبان حاصل کی جائے، پھر قرآن مجید کا مطالعہ غور و فکر سے کیا جائے تو بلاشبہہ ہماری بیماری کا علاج ہوسکتا ہے۔ عرب اور مصر کے مسلمان اس لیے تنزلی کی حالت میں ہیں کہ انہوں نے قرآن مجید میں غور و فکر کرنا چھوڑ دیا ہے۔ دیگر ملکوں کے مسلمان اس لیے پست حالت میں ہیں کہ وہ نہ تو عربی زبان سے اچھی طرح آگاہ ہیں نہ قرآن مجید کا مطالعہ غور و فکر سے کرتے ہیں۔ اگر مغرب کے مسلمان غور و فکر کی عادت ڈالیں اور مشرق کے مسلمان عربی زبان سیکھ کر غور و فکر کرنے لگیں تو ہماری قوم پھر از سر نو زندہ اور بیدار ہوسکتی ہے، ہم نے عام عربوں کو قرآن مجید پر غور و فکر کرنے کی ترغیب دلائی

ہے اوراس کا نہایت عمدہ نتیجہ ہوا ہے۔ اگر اس ملک میں بھی عربی زبان حاصل کرنے، پھر قرآن مجید کا غور وفکر سے مطالعہ کرنے کی ترغیب دلائی جائے تو اس کا نتیجہ بھی نہایت عمدہ ہوگا''۔(۲۳)

سید رشید رضا کے اس علمی ودعوتی سفر پر مولانا ابوالکلام آزاد نے ایک گراں قدر مضمون الہلال کے اولین شمارہ ہی میں تحریر کیا جس کا عنوان تھا:

المصلح العظیم والمرشد الحکیم

اس مضمون میں مدیر الہلال نے سرزمین ہند کو نوواردوں اور اجنبیوں کی جولان گاہ قرار دیا۔ مقدونیہ کے سکندر کو، چین کے سیاحوں کو یہاں کے موسموں اور طلائی مندروں نے اپنی طرف کھینچا۔ اس کے بحری وبری دروازوں پر ملک گیر سیاحوں کی تلواریں چمکتی رہی ہیں لیکن اپریل ۱۹۱۲ء میں یہاں جو سیاح آیا''اس کے کاندھے پر ملک گیری کا علم اور ہاتھ میں فتح یابی کی تلوار نہ تھی، مگر اس کی آنکھوں میں آنسو اور دل میں درد ضرور تھا۔ اس کے پاس ڈھلے ہوئے لوہے کے آلات نہ تھے جس سے انسان کی لاشیں بچھائی جاسکتی ہیں لیکن نور صداقت کا ایک حربہ ضرور تھا جس سے انسانی قلوب کی صفیں الٹ دی جاسکتی ہیں۔ دل کی فتوحات اجسام وزمین کی فتوحات سے زیادہ اہم ہیں:

معمورۂ دلے اگرت ہست باز گوے
کیں جا سخن بہ ملک فریدوں نمی رود''(۲۴)

مولانا آزاد آگے لکھتے ہیں کہ ''شاید سید محمد رشید رضا پہلا سیاح تھا جو عروج واقبال کی بہار لوٹنے کے لیے نہیں بلکہ ادبار وتنزل کی خزاں پر ماتم کرنے کے لیے آیا تھا''۔ فاضل مدیر عہد ماضی کو یاد کرتے ہوئے دوسرے سیاحوں ابوریحان البیرونی (۹۷۳ء۔۱۰۴۸ء) اور ابن بطوطہ (۱۳۰۳ء۔۱۳۷۷ء) کا تذکرہ کرتے ہیں کہ ''ایک زمانہ تھا جب چوتھی صدی ہجری کا سیاح ابوریحان بیرونی اسی سرزمین ہند میں فلسفہ وہیئت کا درس لیتا تھا مگر جب سبق لے کر اٹھتا تھا تو زمین بار بار دھوئی جاتی تھی کہ اجنبی کے بیٹھنے سے ناپاک ہوگئی ہے۔ پھر آٹھویں صدی کی تاریخ ہند کا ایک صفحہ ہے جس میں مغرب اقصی کا جہاں گیر سیاح ابن بطوطہ تغلق آباد کی دیواروں کے نیچے سے گزرا اور یہ وہ زمانہ تھا کہ اسلامی تہذیب وتمدن اس سرزمین کے چپے چپے پر قبضہ کر چکا تھا، یا آج ایک تیسرا زمانہ ہے کہ سید رشید رضا نے ہندوستان کی سیاحت کی مگر بیرونی کی طرح علوم وفنون کی تلاش میں نہیں، کیونکہ مسلمانوں کا علمی دور اب تاریخ کی خاک میں مدفون ہو چکا ہے۔ اور ابن بطوطہ کی طرح اسلامی جاہ وجلال کے دیکھنے کے لیے بھی نہیں، کیونکہ جہاں تغلق آباد کے ایوان ہائے عظمت وشوکت تھے، وہاں اب زاغ وزغن کا آشیانہ ہے، و تــلـك

الایام نداولھا بین الناس''۔(۲۵)

مدیرالہلال آگے تأسف کے ساتھ کہتے ہیں:

''سید رشید رضا آئے بھی اور چلے بھی گئے، مگر شاید ہندوستان میں بہت کم لوگ ہوں گے جوان کی اصلی حیثیت اور حالت سے واقف ہوں گے، لیکن اگر ہم کو آفتاب کی روشنی کی خبر نہ ہوتو یہ ہماری آنکھوں ہی کا قصور ہے۔۔۔سید رشید رضا کو آج تمام اسلامی دنیا جانتی ہے۔انگلستان وفرانس کے وہ تمام علمی وسیاسی حلقے جن کو مشرقی معاملات سے دلچسپی ہے ان سے بےخبر نہیں ہیں۔جاوا اور سنگاپور سے ان کے پاس فتوے اور سوالات آتے ہیں مگر ہندوستان کے مسلمانوں میں نہ صرف عوام بلکہ انگریزی تعلیم یافتہ، بلکہ علماء وفضلاء تک بےخبر ہیں''۔(۲٦)

مشمولات الہلال

الہلال کے اولین شمارے میں فہرست مضامین یہ ہے:

تمہید افتتاحی

مقالات

ناموران غزوۂ طرابلس

افسانۂ عجم

اقصائے مغرب

آخری صفحہ پر ''الہلال کے مضامین کے ابواب'' کے عنوان سے آئندہ شماروں کے مشمولات کا اعلان اس طرح ہے:

مذاکرۂ علمیہ

اس عنوان کے تحت ہمیشہ علمی مضامین، علمی خبریں، جدید اکتشافات، متفرق ابحاث وافکار علمیہ اور علمی استفسارات کے جواب درج ہوا کریں گے۔

احرار اسلام

اس میں بالالتزام تاریخ اسلام کے ان مشہور ناموروں کے حالات درج کیے جائیں گے جنھوں نے مذہبی، علمی اور سیاسی آزادی کے لیے کوئی جاں فروشی اور قربانی کی ہے۔ نیز زمانۂ حال کے نامور احرار کے حالات بھی مع تصاویر شائع کیے جائیں گے۔

افسانۂ عجم

ایران کے متعلق تمام مضامین اور خبریں

مغرب اقصیٰ

مراکش کا یہ باب مخصوص رہے گا۔

اس کے علاوہ مندرجہ ذیل چھوٹے کالموں کے عنوانات ہیں:

مدارس اسلامیہ۔ عالم اسلامی

انتقاد

مراسلات

ضخامت کی افزائش کے ساتھ اور نئے ابواب بھی بڑھتے جائیں گے ہمیشہ ایڈیٹوریل کالم ان کے علاوہ رہے گا اور ابتدا میں بریف نوٹس:

شذرات

کے عنوان سے درج کیے جائیں گے۔

الہلال کے اولین شمارہ کا یہ مختصر تذکرہ اس وضاحت کے لیے کافی ہے کہ اس رسالہ کا مقصد اور نصب العین کیا تھا۔ اس کے مشمولات کا رنگ و آہنگ اور اسلوب کیسا تھا اور اس کی انفرادیت اور پہچان کیا تھی۔ اسی سے اس رسالہ کی عصری معنویت بھی سمجھ میں آتی ہے۔

اولین شمارے کے مشمولات بتاتے ہیں کہ فاضل مدیر مذہب اور سیاست کی یکجائی کے قائل، وکیل اور ترجمان تھے۔ وہ سیاست کو شجر ممنوعہ تصور کرنے کے بجائے دین کو ایک مکمل وحدت کے روپ میں دیکھتے تھے جس کے نظام فکر و عمل میں عقیدہ بھی تھا اور عبادت بھی، روحانیت بھی تھی اور سیاست بھی، تزکیہ نفس بھی تھا اور نظام اجتماعی بھی۔ الہلال کے آئندہ شماروں میں انہوں نے مذہب و سیاست کے اجتماع کو ''روح القدس'' قرار دیا جو مس کو طلائے خالص بنا دیتی ہے اور نا قابلوں کو جوہر گراں مایہ۔ مولانا آزاد نے صراحت کی کہ اسی ''روح القدس'' کے فقدان کی وجہ سے دوسری قوموں کے مقابلے میں مسلمانوں میں ترقی صفر ہے۔ مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کا نہ ہونا، ہندوؤں جیسے قابل اشخاص کی ہم میں عدم موجودگی، سحر بیان مقرر اور جادو نگار اہل قلم کی کمیابی اور ایثار و فدائیت کی مثالوں کا عنقا ہونا سب اس وجہ سے ہے کہ مذہب کو اوہام و خرافات کا مجموعہ بنا کر رکھ دیا گیا ہے اور سیاست کو آدم کے باغ عدن کا شجر ممنوعہ۔ (۲۷)

مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی (۱۸۶۶ء۔۱۹۵۰ء) نے جب الہلال پر اعتراض کیا کہ اس کے دائرہ بحث میں مذہب اور سیاست کی حدیں مل گئی ہیں تو مدیر الہلال نے اس کے جواب میں لکھا کہ

الہلال کا دائرہ بحث ایک ہی ہے: احیاءِ تعلیم اسلامی اور اتباع ماجاء بہ القرآن کی دعوت۔لیکن الہلال کا عقیدہ ہے کہ اگر قرآن خدا کی کتاب اور اس کا دعوی قابل تسلیم ہے تو مسلمانوں کی تعلیم، سیاست، اخلاق، تمدن، معیشت و معاشرت سب کچھ اس میں موجود ہے اور یہ بڑی گمراہی کی بات ہے کہ سیاست اور تعلیم کو مذہب سے الگ سمجھا جائے:

''بے شک وہ تعلیم اور پالیٹکس جس پر اب تک مصلحین امت عامل رہے ہیں مذہب کے ساتھ ایک دائرہ میں نہیں آسکتے، کیونکہ غلامی اور توحید، حق اور باطل، کفر اور اسلام کبھی ایک جگہ جمع نہیں ہوئے۔لیکن شاید مولانا کی نظر اس پر نہ گئی کہ الہلال جس تعلیم اور پالیٹکس کی طرف بلاتا ہے وہ تو یکسر قرآن ہی سے ماخوذ ہے اور جب دعوت قرآنی اس کا مقصد ہے تو لازمی طور پر وہ بھی اس کے دائرہ بحث میں ہے اور جب تک اسلام دنیا میں باقی ہے، ہمیشہ رہے گا''۔(۲۸)

الهلال کا نصب العین

الہلال کے اولین شمارے کے محتویات بتاتے ہیں کہ مولانا آزاد کا مشن اور ان کا نصب العین کیا تھا۔انہوں نے الہلال کا شعار سورہ آل عمران کی آیت ۱۳۹ کو قرار دیا تھا:

وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ۔

صفحہ اول پر سورۃ الحج آیت ۷۸ اردو ترجمانی کے ساتھ درج کی تھی جس میں اللہ نے جہاد کرنے کا حکم دیا ہے اور حضرت ابراہیمؑ کے ذریعہ ملت اسلامیہ کا نام مسلمان تجویز کرنے کی صراحت کی ہے۔ رسول کی شہادت حق اور مسلمانوں کے شہداء علی الناس ہونے کی گواہی ہے اور اہل ایمان کو اقامت صلوۃ، ایتائے زکوۃ اور اعتصام باللہ کی تلقین ہے۔حمد وثنا کے کلمات میں مولانا آزاد نے جس دعا کا انتخاب کیا تھا، وہ بھی ان کے مشن کی طرف اشارہ کررہی ہے:

رب أدخلني مدخل صدق وأخرجني مخرج صدق واجعل لي من لدنك سلطاناً نصيراً(۸:۱۷)

یہ تو رموز و اشارات کی زبان تھی مگر اہل حق و صداقت کے لیے اشارہ ہی کافی ہوتا ہے۔آگے چل کر مولانا آزاد نے رمز و کنایہ کا پردہ اٹھایا اور صریح لفظوں میں اپنے مشن اور نصب العین کا اعلان کیا۔ الہلال نے مسلمانوں کو تعلیم دی کہ انگریزی حکومت پر بے جا اعتماد نہ کرو اور نہ غیروں کے حلقہ درس میں شمولیت اختیار کرو بلکہ اس راہ پر چلو جو اسلام کی بتائی ہوئی صراط مستقیم ہے۔الہلال کے صفحات نے اس نصب العین کی تشریح اس طرح کی:

(۱) اسلام کی اساس اولین توحید ہے۔ توحید کا مطلب خدا کو ایک ماننا اور اس کی صفات میں دوسری ہستی کو شریک نہ کرنا ہے۔

(۲) مسلمانوں کو خیرالامم بنا کر بھیجا گیا ہے۔ انہیں خلافت اور نیابت بخشی گئی ہے اس لیے انہیں اپنے اندر افسردگی، بے ہمتی اور خوف و مرعوبیت کی جگہ بلندی، خودداری اور طاقت واستحکام پیدا کرنا چاہیے۔ اللہ نے مسلمانوں کو امۃً وسطاً قرار دیا ہے اس لیے ہر معاملہ میں انہیں میانہ روی اور اعتدال کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔

(۳) مسلمان دنیا میں صلح و امن کے پیامبر ہیں۔ وہ تلوار بھی اٹھاتے ہیں تو صلح کی حمایت میں۔ فتنہ وفساد ان کے ہاں معیوب اور موجب فسق وعصیان ہے۔

(۴) قرآن نیکی اور بھلائی کے کاموں میں تعاون کی تعلیم دیتا ہے اس لیے نیکی کی حفاظت کرنے اور فساد کو دور کرنے کے مسلمان ذمہ دار ہیں۔

(۵) قرآن شخصی استیلاء واقتدار کی مخالفت کرتا ہے، اس کے نزدیک شخصی حکومت ناجائز ہے۔ پس مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ آزادی کے حصول کے لیے جدوجہد کریں اور جب تک پارلیمنٹری حکومت قائم نہ ہو جائے وہ خاموش نہ ہوں۔ (۲۹)

ایک دوسرے شمارے میں الہلال کی جامع دعوت کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا:

''الہلال کا مقصد اصلی اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ مسلمانوں کو ان کے تمام اعمال ومعتقدات میں صرف کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ پر عمل کرنے کی دعوت دیتا ہے اور خواہ تعلیمی مسائل ہوں خواہ تمدنی، سیاسی ہوں خواہ کچھ اور، وہ ہر جگہ مسلمانوں کو صرف مسلمان دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کی صدا صرف یہی ہے کہ تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا و بینکم (۳:۵۷) اس کتاب اللہ کی طرف آؤ جو ہم اور تم دونوں میں مشترک ہے اور جس سے کسی کو اعتقاداً انکار نہیں مگر عملاً یہ حال ہے کہ الذین قالوا آمنا بأفواھھم ولم تومن قلوبھم ،انہوں نے زبان سے تو کہہ دیا کہ ہم ایمان لائے ہیں لیکن ان کے دلوں میں ایمان نہیں۔'' (۳۰)

آزادی کا صور

الہلال کی فائلوں کو کھنگالیے تو اندازہ ہوتا ہے کہ تحریک آزادی میں مسلمانوں کی سرگرم شرکت مولانا آزاد کے نزدیک قرآنی احکام وتعلیمات پر مخلصانہ عمل آوری کا نتیجہ تھا، مگر سیاست اور آزادی کے میدان میں وہ دریوزہ گری اور کسی دیگر نمونہ سے کسب فیض کے خلاف تھے۔ ان کے خیال میں مسلمانوں

کو آزادی کی تحریک میں کسی کی تقلید کرنے کے بجائے قیادت اور رہنمائی کا فریضہ انجام دینا چاہیے۔

ایک قاری کے سوال کے جواب میں مدیر الہلال کا یہ جواب آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے:

''آپ پوچھتے ہیں کہ آج کل ہندوؤں کے دو پولیٹکل گروہ موجود ہیں ان میں سے آپ کن کے ساتھ ہیں؟ گزارش ہے کہ ہم کسی کے ساتھ نہیں ہیں بلکہ صرف خدا کے ساتھ ہیں۔ اسلام اس سے بہت ارفع واعلی ہے کہ اس کے پیروؤں کو اپنی پولیٹکل پالیسی قائم کرنے کے لیے ہندوؤں کی پیروی کرنی پڑے۔ مسلمانوں کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی شرم انگیز سوال نہیں ہوسکتا کہ وہ دوسروں کی پولیٹکل تعلیموں کے آگے جھک کر اپنا راستہ پیدا کریں۔ ان کو کسی جماعت میں شامل ہونے کی ضرورت نہیں، وہ خود دنیا کو اپنی جماعت میں شامل کرنے والے اور اپنی راہ پر چلانے والے ہیں اور صدیوں تک چلا چکے ہیں۔ وہ خدا کے سامنے کھڑے ہو جائیں تو ساری دنیا ان کے سامنے کھڑی ہو جائے گی''۔(۳۱)

اٹاوہ اتر پردیش کے ایک قاری محمد حسین آزاد کے سوال کے جواب میں مولانا آزاد نے اپنے اس موقف کا اعادہ کیا:

''ہم تو اسے خود مسلمانوں کی سب سے بڑی غلطی سمجھتے ہیں کہ ہمیشہ انہوں نے اپنے دو ہی راستے دیکھے یا گورنمنٹ پر اعتماد یا ہندوؤں اور کانگریس میں شرکت، یعنی ہمیشہ آزادیٔ سیاسی کو ہندوؤں کا مرادف سمجھا، مگر خود اپنے تئیں بھولے رہے اور اس لیے بھولے رہے کہ خدا کو بھلا دیا، ولا تکونوا کالذین نسوا الله فأنساهم أنفسهم''۔(۳۲)

عصری معنویت

آج الہلال کی اشاعت کو ایک صدی مکمل ہوگئی ہے۔ مولانا آزاد نے جن مقاصد اور عزائم کا اظہار الہلال کے صفحات میں کیا تھا ان میں بلاشبہہ جزوی کامیابی انہیں ملی۔ ہندوستانی مسلمان پست ہمتی اور شکست خوردگی کی ذہنیت سے نکل کر تحریک آزادی میں شامل ہوئے اور ملک آزادی وحریت کی راہ پر گامزن ہوا، مگر الہلال کا مشن اس سے بہت بلند تھا۔ حصول آزادی اس کے طویل سفر کا ایک پڑاؤ تھا، منزل نہیں تھی۔ منزل تھی مسلمانوں کو خود کفالتی کی راہ پر گامزن کرنا۔ تعلیم، سیاست اور روحانیت کے میدانوں میں دوسروں کے سامنے دریوزہ گری کرنے سے بچانا۔ انہیں فرقہ پرستی، مسلکی تشدد، اور اقلیت واکثریت کے مخمصوں سے نکال کر قرآن کی بتائی ہوئی راہ، صراط مستقیم، پر چلنے کا سلیقہ سکھانا۔ خود سپردگی اور احساس کمتری سے اوپر اٹھ کر ملک کی تعمیر وترقی میں برابر کی حصہ داری نبھانے کے قابل بنانا۔ اس نصب العین کی طرف پیش قدمی آج کی اہم ضرورت ہے اور اس سیاق میں الہلال کی افادیت ومعنویت

آج پہلے سے زیادہ ہوگئی ہے۔

حواشی وتعلیقات

(۱) قرآن کریم، آل عمران: ۱۳۹/آیت کا ترجمہ یہ ہے: ''دل شکستہ نہ ہو، غم نہ کرو، تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن ہو''۔

(۲) الہلال۔ ایک ہفتہ وار مصور رسالہ، کلکتہ، جلد اول، نمبر ا، ۱۳/جولائی ۱۹۱۲ء، ص:۳۔ سید جمال الدین افغانی کی تصویر کو مولانا آزاد نے اس شعر سے خراج عقیدت پیش کیا ہے:

تو نخل خوش ثمرے کیستی ، کہ باغ وچمن
ہمہ زخویش بریدند ودرتو پیوستند

(۳) نفس مصدر، ص:۱۲۔ مولانا آزاد نے جاوید بک کے بارے میں مزید معلومات فراہم کی ہیں: ''طرابلس کے مختلف حصوں کے اکثر معرکوں میں یہ ابتدا سے شریک کارزار رہا۔ اور ہر میدان سے نامورانہ وسربلندانہ پلٹا۔ اکثر موقعوں میں جب نہایت پرخطر اور مخدوش جنگی خدمات کی ضرورت ہوئی تو سب سے پہلے اسی نے اپنی جگہ سے حرکت کی۔ بارہا ایسا ہوا کہ بھیس بدل کر تن تنہا نکل گیا ہے اور گھنٹوں اٹالین کیمپ کی سیر کرتا رہا ہے۔ ایک مرتبہ کسی ایسے ہی مخدوش موقع میں دشمنوں کے سخت محاصرہ میں آ گیا تھا لیکن اپنی بے جگری اور بے باکانہ شجاعت کی وجہ سے صاف بچ کر نکل گیا۔ ادرنہ کے دو سخت معرکے تو اسی کی شجاعت ودلیری سے سر ہوئے۔ انور بک نے اپنے مراسلات میں چند بہادروں کے کارناموں کی خصوصیت کے ساتھ داد دی ہے ان میں دوسرا نام اسی صاحب تصویر کا ہے، متع الله الاسلام والمسلمين بحفظ وجوده وطول حياته۔

(۴) نفس مصدر، ص:۱۳۔ مولانا آزاد ''مصر کی ڈاک'' کالم کے تحت اسی صفحہ پر اپنی تحریر کا آغاز اس طرح کرتے ہیں: ''شیخ سلیمان البارونی عثمانی پارلیمنٹ میں جبل غزلی کی طرف سے ممبر ہیں، اور منجملہ ان ملت پرستان غیور کے ہیں جنھوں نے آغاز جنگ سے اپنی زندگی غزوۂ طرابلس کے نذر کردی۔ گزشتہ دسمبر میں جب یہ طرابلس پہنچے تو قبائل عرب میں جہاد کی تحریک ابھی نئی نئی شروع ہوئی تھی، اور انور بک کسی رفیق ومعین کے لیے نہایت مضطر تھے۔ انہوں نے پہنچتے ہی ابتدائی ایک ماہ دورے میں صرف کیا اور جب واپس آئے تو مجاہدین عرب کے گروہ گروہ ان کے یمین وشمال تھے۔ آئندہ نمبر میں ان کے متعدد معرکوں کی تصاویر الہلال میں درج کی جائیں گی''۔

(۵) قرآن کریم مع اردو ترجمہ وتفسیر (ترجمہ محمد جوناگڑھی، تفسیر: صلاح الدین یوسف)، شاہ فہد قرآن کریم پرنٹنگ کمپلیکس، مدینہ منورہ، ۱۴۱۹ھ، ص ۷۸۹-۷۸۰

(۶) مودودی، سید ابوالاعلیٰ، تفہیم القرآن، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی، مارچ ۱۹۸۵ء،

جلد دوم، ص: ۶۳۸، حاشیہ: ۱۰۰
(۷) الہلال، جلد اول، شمارہ: ۱، ۱۳/ جولائی ۱۹۱۲ء، ص: ۱
(۸) نفس مصدر: ص ۲۔۳
(۹) نفس مصدر: ص ۳
(۱۰) نفس مصدر: ص ۳
(۱۱) نفس مصدر، ص ۱۲۔ تلوار و قلم کے اجتماع پر گفتگو کرتے ہوئے مولانا آزاد نے جاوید بک کو بھی اس کا مصداق قرار دیا ہے، جس کی جگہ ترک اہل قلم میں ممتاز تھی۔ اس کے علمی مضامین اکثر بلند پایہ علمی رسائل میں شائع ہورہے تھے اور تمام علمی حلقوں میں وقعت کی نظر سے دیکھے جارہے تھے۔ انقلاب عثمانی کے بعد جب اس نے اپنی مشہور تصنیف ''تاریخ انقلاب سیاسی یوروپ خصوصاً فرانس''، دو ضخیم جلدوں میں شائع کی تو الہلال کے بقول، اس قدر مقبول ہوئی کہ تین سال کے اندر دو مرتبہ ہزاروں کی تعداد میں چھپ کر فروخت ہوگئی، مگر جب طرابلس میں جنگ چھڑی تو اس نے کاغذ قلم پھینک کر بندوق ہاتھ میں اٹھالی۔
(۱۲) صحیح بخاری کی روایت کے الفاظ ہیں۔ حضرت ابو ہریرہؓ اس حدیث کے راوی ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لا تشد الرحال الا الی ثلاثة مساجد: المسجد الحرام، ومسجد الرسول صلی الله علیه وسلم ومسجد الاقصی۔ (سفر کا قصد نہیں کیا جاتا مگر تین مسجدوں کے لیے: مسجد حرام، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد اور مسجد اقصی۔) کتاب فضل الصلوۃ فی مکة والمدینة، باب فضل الصلوۃ فی مسجد مکة والمدینة، حدیث نمبر ۱۱۸۹۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، حدیث نمبر ۱۳۹۷ کے الفاظ قدرے مختلف ہیں: لا تشد الرحال الا الی ثلاثة مساجد: مسجدی هذا ومسجد الحرام ومسجد الاقصی۔ امام ترمذی، کتاب الصلوۃ، حدیث نمبر ۳۲۶ میں حضرت ابوسعید الخدری سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لا تشد الرحال الا الی ثلاثة مساجد: مسجد الحرام ومسجدی هذا ومسجد الاقصی۔ امام ترمذی نے اسے حسن صحیح قرار دیا ہے۔
(۱۳) دیکھئے مقالہ ''ابن تیمیہ'': اردو دائرہ معارف اسلامیہ، دانش گاہ پنجاب لاہور، جلد اول، ۱۳۸۴ھ/۱۹۶۴ء، طبع اول، ص ۴۵۴۔۴۵۹
(۱۴) ابن عبدالہادی، تذکرۃ الحفاظ، جلد اول، ص ۴۲
(۱۵) خان صدیق حسن، اتحاف النبلاء، کانپور، ۱۲۸۹ھ، ص ۲۰۲۔۲۲۱
(۱۶) برق، غلام جیلانی، امام ابن تیمیہؒ، لاہور

(۱۷) ابوزہرہ، امام ابن تیمیہؒ۔ حیات عصر، منہاج، فقہ، اردو ترجمہ: سید رئیس احمد جعفری اور سید نائب حسین نقوی، شیخ غلام علی اینڈ سنز پرائیویٹ لیمٹیڈ لاہور، ۱۹۹۱ء (اشاعت دوم)، باب ۱۹، آثار ابن تیمیہ، ص ۶۸۵۔۷۱۱

(۱۸) نفس مصدر، ص ۷۱۲۔۷۳۷

(۱۹) الہلال، جلد اول، شمارہ: ۱، ۱۳/ جولائی ۱۹۱۲ء، ص ۱۲

(۲۰) نفس مصدر۔ مولانا آزاد نے یہ فلسفیانہ نکتہ طرازی سلاطین عثمانیہ کی جنگ عظیم اول میں شرکت کے تناظر میں کی ہے۔ ترک اہل قلم جو فوج میں شامل ہوئے اور دشمنوں کے خلاف دادِ شجاعت دی، آزاد کی تحسین وتبریک کے اولین مستحق قرار پائے۔ انہیں تلوار اور قلم کا اجتماع ایک بار پھر نظر آنے لگا۔ وہ اسی مقالہ میں لکھتے ہیں:

''ہجوم خیالات سلسلۂ سخن قائم رکھنے نہیں دیتا۔ جنگ طرابلس نے گزری ہوئی باتوں کو پھر زندہ کر دیا ہے۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ اعلان جنگ کے ساتھ ہی سینکڑوں اہل علم اور صاحبان درس وتدریس ترکوں نے قلم کی جگہ شمشیر کا وقت دیکھا تو عثمانی دفتر جنگ کی میز کو عرضداشتوں سے بھر دیا۔ مصر سے والنٹیئر وں کی جو جماعتیں گئی ہیں ان میں ایک بڑی جماعت مدرسوں کے طلبہ اور ارباب قلم کی بھی ہے جو آج درنہ اور عزیزیہ کے میدان میں تربیت یافتہ سپاہیوں کی طرح لڑ رہی ہے۔ العلم قاہرہ کا نامہ نگار لکھتا ہے کہ ''ان مصری والنٹیئر وں نے اپنی شجاعت وکاردانی سے تمام عثمانی سپاہ کو متحیر کر دیا ہے''۔ نفس مصدر، ص ۱۲

(۲۱) ندوی، سید سلیمان، حیات شبلی، دار المصنفین اعظم گڑھ، ۱۹۴۳ء، ص ۴۹۹

(۲۲) علامہ سید محمد رشید رضا مصری کا استقبال لکھنؤ میں کس جوش وخروش اور اسلامی حمیت کے ساتھ ہوا اس کا تذکرہ ''تاریخ ندوۃ العلماء'' حصہ دوم مرتب مولوی شمس تبریز خاں، دفتر نظامت ندوۃ العلماء لکھنؤ، ۱۴۰۴ھ/ ۱۹۸۴ء، ص ۹۴۔۹۵ میں کیا گیا ہے۔ روداد اجلاس کے مرتب لکھتے ہیں کہ:

''اسٹیشن (لکھنؤ) پر استقبال کی خاص طور پر تیاریاں کی گئی تھیں۔ تمام شہر میں ان کے استقبال کے لیے جلی حرفوں میں اشتہارات چسپاں کیے گئے تھے۔ معززین واکابرین کی خدمت میں خطوط روانہ کیے گئے تھے۔ اس بنا پر اسٹیشن پر نہایت کثرت سے لوگ جمع ہو گئے تھے اور علماء، طلبہ، روساء، غرض ہر طبقہ کے اصحاب استقبال کے لیے تشریف لائے تھے جن میں سے بعض اصحاب باہر سے صرف اسی غرض سے آئے تھے۔ آنریبل سر راجہ محمد علی خاں صاحب بہادر والی محمود آباد نے ان کی سواری کے لیے خاص طور پر اپنی گاڑی بھیجی تھی۔

اسٹیشن پر آٹھ بجے سے لوگ جمع ہونا شروع ہوئے۔ علامہ رشید رضا ۹ ر بجے پنجاب میل سے مع مولوی عبدالحق صاحب حقی بغدادی کے تشریف لائے۔ سید صاحب ممدوح کے گاڑی سے اترتے ہی معانقہ ومصافحہ کے لیے پر جوش مسلمانوں کا وہ ہجوم ہوا کہ بمشکل لوگ ان تک پہنچ سکتے تھے۔ درمیان سے گزرتے ہوئے وہ باہر تشریف لائے اور راجہ صاحب موصوف کی پر تکلف فٹن میں بیٹھ گئے۔ گاڑی نصف راہ تک آہستہ آہستہ چلی۔ پیچھے پیچھے روساء کی گاڑیاں تھیں۔ ساتھ ساتھ دارالعلوم کے طلبہ اور پر جوش مسلمانوں کی ایک جماعت تھی۔ یہ سب ٹھہر ٹھہر کر اھلاً وسھلاً مرحباً کے نعرے بلند کرتے تھے اور سید صاحب کا متانت آمیز تبسم اس کا جواب دیتا تھا۔ لیکن نصف راہ سے مسلمانوں نے جوش مسرت سے گاڑی کے گھوڑے کھول دیئے اور مسٹر ممتاز حسین بیرسٹر کے مکان تک (جہاں آپ فروکش ہونے والے تھے) خود گاڑی کھینچ لائے۔

راستے میں عام لوگ اور دوکاندار مسلمانوں کے اس مذہبی جوش ولولہ اور اخوت اسلامی کی اس زندہ تصویر کو دیکھنے کے لیے اپنے اپنے گھروں سے نکل آئے۔ راستے میں ہر جگہ غیر اسلامی افراد اس اسلامی منظر کو تعجب وحیرت کے ساتھ دیکھتے تھے''۔

(۲۳) تاریخ ندوۃ العلماء، حوالہ بالا، ص ۹۸۔۹۹

(۲۴) اشارہ ہے سید محمد رشید رضا کی آمد کی طرف۔ الہلال، ۱۳ر جولائی ۱۹۱۲ء، ص ۴

(۲۵) نفس مصدر، ص ۴۔۵

(۲۶) نفس مصدر، ص ۵

(۲۷) الہلال، جلد اول، شمارہ ۱۴، اگست ۱۹۱۲/۴ء، ص ۱۰۔۱۱

(۲۸) الہلال، جلد اول، شمارہ ۱۵، اکتوبر ۱۹۱۲/۲۳ء، ص ۴

(۲۹) الہلال، جلد اول، شمارہ ۹، ستمبر ۱۹۱۲/۸ء، ص ۷۔۸

(۳۰) الہلال، جلد اول، شمارہ ۹، ستمبر ۱۹۱۲/۸ء، ص ٦

(۳۱) الہلال، جلد اول، شمارہ ۹، ستمبر ۱۹۱۲/۸ء، ص ۷

(۳۲) الہلال، جلد اول، شمارہ ۱۲، ستمبر ۱۹۱۲/۱۲ء، ص ۳۔۴

ہمارے زمانے کا جامعہ

ڈاکٹر عبدالقوی فلاحی، ممبئی۔موبائل نمبر:9320885757

*(گزشتہ شماروں میں فضیلت سے فارغ ہونے والے ہمارے فلاحی بھائیوں نے اپنے زمانہ طالب علمی کی کچھ یادیں اور تاثرات ہمارے ساتھ شیئر کیے تھے،اس ماہ ۱۹۷۹ء میں فضیلت سے فارغ ہونے والے ہمارے ایک برادر بزرگ کی تحریر پیش خدمت ہے۔ ان شاء اللہ اس کالم سے ہمارے لیے ابتدائی دور کے حالات سے واقفیت حاصل کرنے، ابتدائی لوگوں کے خوابوں اور تمناؤں سے آشنا ہونے،اس کی روشنی میں حال کا جائزہ لینے اور مستقبل کے لیے منصوبہ بندی کرنے میں آسانی ہوگی۔ **مدیر**)*

عنوان سنتے ہی وہاں چالیس سال قبل گزرے ہوئے قیمتی سات سالوں کی تمام حسین یادیں تازہ ہوگئیں۔

دیہات کے ایک چھوٹے سے قریہ سے نکل کر پہلی بار جامعۃ الفلاح کے احاطہ میں قدم رکھا تھا۔ عظیم الشان مسجد، کشادہ صحن، جس صحن میں طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے برصغیر کی عظیم ہستی مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے فرمایا تھا کہ ''اگر میرے بس میں ہوتا تو اس مسجد کو راتوں رات ندوہ پہنچا دیتا''۔

مسجد سے متصل جنوب کی جانب مودودی منزل کی حسین وکشادہ عمارت۔اسی سے متصل مشرق ومغرب کی جانب پھیلی ہوئی حسن البنا منزل۔شمال مشرق کی جانب مطبخ کی عمارت۔ان سب کے درمیان کھیل کود کا وسیع وعریض میدان۔نظر پڑتے ہی میں مبہوت سا رہ گیا تھا۔دل سے یہی دعا نکلی تھی کہ اے اللہ میں یہاں سے کچھ بن کر نکلوں۔اللہ تعالی نے میری دعا سن لی اور جو کچھ بھی میں ہوں اسی مادر علمی کی تعلیم وتربیت کے نتیجے میں ہوں، فالحمدللہ علی ذلک۔

میں نے جامعۃ الفلاح کا نام بھی نہیں سنا تھا۔نہ یہ پتہ تھا کہ یہ ادارہ کہاں ہے، بس مشیت الٰہی سے میں وہاں پہنچ گیا۔

۱۹۷۱ء میں والد محترم کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔اس وقت میری عمر ۱۱؍سال تھی۔میرے دادا مرحوم

اس وقت حیات تھے۔ ہمارے دو چچا تھے۔ بڑے چچا سراج الحق خاں صاحب مرحوم اور چھوٹے چچا مولانا شمس الحق شمیم بستوی مقیم حال علی گڑھ تھے۔ سب لوگ باہم مشورہ کر رہے تھے کہ عبدالقوی کو پڑھایا جائے یا کسی کام پر لگا دیا جائے۔ کیونکہ کفالت کا مسئلہ تھا۔ دادا نے مشورہ دیا کہ اسی سے پوچھ لو اگر پڑھے تو کہیں داخلہ دلا دو۔ میں سامنے ہی کھیل رہا تھا اور ان لوگوں کی باتیں سن رہا تھا۔ بلا کر پوچھا گیا۔ میں نے کہا پڑھوں گا۔ کیونکہ اس وقت ہمارے سبھی ساتھی پڑھ رہے تھے۔

میں نے ابتدائی تعلیم گاؤں ہی کے مدرسہ شمس العلوم موضع سحرا ضلع بستی موجودہ سدھارتھ نگر میں حاصل کی تھی۔ اس وقت وہاں درجہ ہفتم (عربی اول) تک تعلیم ہوتی تھی۔ چونکہ میرا گاؤں بلکہ پورا علاقہ اہل حدیثوں کا ہے۔ مدرسہ کے ناظم مولانا عبدالمبین منظر صاحب مرحوم تھے، جو جماعت اسلامی کے سخت مخالف تھے۔ یہاں تک کہ مولانا مودودی علیہ الرحمہ کے خلاف دو تین کتابیں بھی انہوں نے لکھی تھیں۔ ایک کتاب کا نام یاد ہے ''اسلام ایک نیا مذہب فکر''۔

ہمارا جواب سن کر محترم چچا سراج الحق خاں صاحب مرحوم نے کہا کہ میں اس کو پڑھاؤں گا۔ کلکتہ جا رہا ہوں۔ سوچ کر بتاؤں گا کہ کہاں داخلہ لینا ہے۔

ہمارے ہم سبق ساتھی بنارس اور مئو کے اہل حدیث مدرسوں میں داخلہ کے لیے جا رہے تھے۔ میں گھر پر چچا کے خط کا انتظار کر رہا تھا۔ چچا محترم کلکتہ چلے گئے۔ وہاں جماعت اسلامی کے امیر مقامی جناب حافظ نذیر احمد صاحب مرحوم تھے (عبدالرحمٰن خالد فلاحی کے والد محترم)۔ ان سے چچا کے اچھے مراسم تھے۔ چچا نے ان سے مشورہ کیا۔ مرحوم نے جامعۃ الفلاح میں داخلہ کا مشورہ دیا، اور خود ہی ناظم جامعہ کے نام سفارشی خط بھی لکھ دیا۔ اس وقت ناظم جامعہ استاذ محترم مولانا ابوبکر اصلاحی مرحوم نور اللہ مرقدہ تھے۔ داخلہ کی منظوری کا خط ناظم صاحب نے میرے گھر سحرا ضلع بستی کے پتہ پر پہنچا۔ چچا مرحوم نے بھی خط بھیجا کہ تمہارا داخلہ جامعۃ الفلاح میں ہو جائے گا۔ یہ بھی لکھا کہ ہمارے ساتھی اللہ بخش کا لڑکا وہاں پہلے سے زیر تعلیم ہے وہ ابھی گاؤں پر ہے اس کے گھر چلے جاؤ، اسی کے ساتھ جامعہ چلے جانا۔ اس طرح میں عبدالسمیع فلاحی صاحب کے ہمراہ جامعۃ الفلاح پہنچ گیا۔

عصر کی نماز سے قبل جامعہ پہنچا تھا۔ عبدالسمیع صاحب کے کمرے میں سامان رکھ کر سیدھے مسجد کا رخ کیا۔ نماز کے بعد مولانا شہباز اصلاحی مرحوم جو نگران اعلی تھے، انہوں نے اعلان کیا کہ تمام طلبہ مودودی ہاسٹل کے سامنے جمع ہو جائیں۔ دو الگ الگ صف بنانے کا حکم ہوا۔ ایک صف میں وہ طلبہ جو اول وقت میں جامعہ پہنچے تھے۔ دوسری صف تاخیر سے پہنچنے والوں کی تھی۔ میں بھی دوسری صف میں کھڑا ہو گیا۔ نہ سوال نہ جواب، سب لوگ ہاتھ آگے بڑھاؤ، مولانا ایک طرف سے ایک ایک چھڑی رسید

کرتے چلے گئے۔ داخلہ سے قبل ہی مولانا کی وہ ایک جھڑکی ہمیشہ یاد رہے گی۔ دوسرے دن داخلہ ٹسٹ ہوا، جو مولانا شبیر احمد اصلاحی مرحوم ومغفور نے لیا تھا۔ عربی اول میں داخلہ ہوا۔

۱۹۷۲ء سے ۱۹۷۹ء تک یہاں زیر تعلیم رہا، اور فضیلت تک تعلیم مکمل کی۔ ۱۹۷۹ء میں فارغ ہوا اور اسی سال علی گڑھ میں بی یو ایم ایس میں داخلہ مل گیا۔ وہاں ۵/سالہ طب کا کورس مکمل کیا۔ ایک سال بہرائچ ضلع اسپتال میں انٹرن شپ کی، پھر ایک سال وطن مالوف ضلع بستی میں میڈیکل پریکٹس کی۔ ۱۹۸۷ء میں ممبئی چلا آیا اور پھر یہیں کا ہو کر رہ گیا۔

پہلا سال مکمل کرکے تعطیل کلاں میں جب گھر واپس آیا۔ اس وقت پرانے ہم سبق ساتھی جنہوں نے جامعہ سلفیہ بنارس جامعہ اثریہ مئوناتھ بھنجن اور دیگر اہل حدیث مدرسوں میں داخلہ لیا تھا وہ بھی گھر آئے ہوئے تھے۔ سب مل کر چڑھا رہے تھے کہ یہ حنفی مدرسے میں چلا گیا۔ حنفی ہوگیا ہے، مقلد ہوگیا ہے، وغیرہ وغیرہ۔

یہ بات گاؤں کے ناظم مدرسہ مولانا عبدالمبین منظر صاحب مرحوم کے علم میں آئی، انہوں نے سب کو مدرسہ پر بلوایا۔ مولانا خود بھی انہی ساتھیوں کے ہم نوا تھے۔ بنارس، مئو اور دیگر اہل حدیث اداروں کی تعریف کے پل باندھے جارہے تھے۔ اور جامعۃ الفلاح کو مقلدوں، حنفیوں اور جماعت اسلامی والوں کا مدرسہ کہہ کر نیچا دکھانے کی کوشش کررہے تھے۔

مولانا سے مخاطب ہوکر میں نے پوچھا کہ اجازت دیں تو میں کچھ بولوں، مولانا نے کہا: ٹھیک ہے بولو، کیا کہنا چاہتے ہو۔

میں نے ان لوگوں سے سوال کیا:

(۱) کیا آپ کے مدرسے میں اہل حدیث کے علاوہ دوسرے مسلک کے طلبہ بھی پڑھتے ہیں؟

سب کا جواب ایک ہی تھا کہ نہیں۔

(۲) دوسرا سوال میں نے پوچھا کہ تعلیم کا مقصد کیا ہے؟

اس سوال پر بہت دیر تک باتیں ہوتی رہیں کوئی صحیح جواب نہ دے سکا۔ ان سب کا جواب بس یہ تھا کہ پڑھ لکھ کر عالم بن جائیں گے پھر کسی مدرسے میں پڑھائیں گے یا کسی مسجد میں امامت کریں گے اور پرسکون زندگی گزاریں گے۔ ایک دلچسپ جواب یہ تھا کہ بنارس جامعہ سلفیہ سے فارغ ہوکر مدینہ چلے جائیں گے، وہاں کے فارغین کو وہاں داخلہ مل جاتا ہے، وہاں وظیفہ کی شکل میں جو رقم ملتی ہے ہم اور ہمارے اہل خانہ پرتعیش زندگی گزاریں گے۔

(۳) تیسرا سوال میں نے کیا کہ آپ لوگوں کے یہاں کھانے کا کیا نظم ہے؟ اور کیا آپ لوگ

طعام فیس ادا کرتے ہیں؟

اس کا جواب سن کر تو حیرت کی انتہا نہ رہی کہ ان اہل حدیث اداروں میں طلبہ ہوں یا اساتذہ، امیر ہوں یا غریب، سبھی لوگ اپنے خورد ونوش کا مکمل کفیل مدرسہ کو ہی سمجھتے ہیں اور طلبہ اپنے ساتھ پلیٹ اور پیالہ رکھتے ہیں، لائن لگا کر کھانا لیتے اور اپنے اپنے کمروں میں لے جا کر کھا لیتے ہیں۔ اساتذہ کے لیے الگ سے مرغن کھانا بنتا ہے اور ان کے کمروں میں پہنچا دیا جاتا ہے۔

(۴) چوتھا اور آخری سوال کھیل کود اور حفظان صحت سے متعلق کیا۔

اس کا جواب یہ ملا کہ صرف جامعہ سلفیہ بنارس میں نظم ہے اور وہ بھی صرف والی بال کا نظم ہے، چند طلبہ اور اساتذہ اس میں حصہ لیتے ہیں۔ دوسرے اداروں میں اس کا بھی نظم نہیں ہے۔

میں نے ان سوالوں کا ترتیب سے جواب دیا:

جامعۃ الفلاح مسلکی تعصب سے بالکل پاک ہے اور یہاں اہل حدیث اور حنفی مسلک سبھی طرح کے طلبہ زیر تعلیم ہیں، سب اپنے اپنے مسلک پر عمل کرتے ہیں۔

دوسرا سوال مقصد تعلیم کیا ہے، اس کا سیدھا اور آسان سا جواب اللہ تعالی نے جس مقصد کے لیے ہمیں پیدا کیا ہے اس کا شعور وادراک، انبیاء کرام کی بعثت کا جو مقصد تھا اسی مقصد کی تکمیل علماء کی ذمہ داری ہے، یعنی قرآن وسنت کا گہرا علم اور صحیح دینی بصیرت پیدا کر کے انبیائی مشن کو آگے بڑھانا۔

تیسری بات کھانے کے نظم سے متعلق جامعۃ الفلاح میں ایک مطبخ اور طعام گاہ ہے، سبھی طلبہ اور اساتذہ کا کھانا ایک ساتھ بنتا ہے، اساتذہ کرام کا کھانا ان کے کمرے پر پہنچا دیا جاتا ہے اور طلبہ ایک ساتھ دسترخوان پر مخصوص طریقے سے بیٹھ کر کھاتے ہیں۔ دسترخوان پر بولنے کی اجازت نہیں ہے بلکہ انگلیوں کے اشارہ سے پانی، دال، روٹی، چاول مانگتے ہیں۔

طلبہ فضیلت سال اول میں سے ایک مانیٹر مقرر کرتے ہیں، اس کی ذمہ داری ناظم مطبخ کے ساتھ تعاون کرنا، کھانے پینے کی نگرانی کرنا، اور کھانا کھلانے کے لیے گروپ بنانا ہوتی تھی، اس طرح ہفتہ میں ایک دن ہر طالب علم کی باری کھانا کھلانے کی ہوتی ہے۔

جامعۃ الفلاح میں خود کفالتی کا رجحان ہے۔ طلبہ ماہانہ طعام فیس ادا کرتے ہیں، البتہ غیر مستطیع طلبہ کی کفالت جامعہ کے ذمہ ہے، مگر اس طرح کہ کسی طالب علم کو خبر نہیں ہوتی کہ کون غیر مستطیع ہے، اس سے عزت نفس کو ٹھیس نہیں پہنچتی۔

جامعۃ الفلاح میں ورزش اور کھیل کود کا باقاعدہ نظم ہے۔ عصر تا مغرب کا وقت اس کے لیے مخصوص ہے، والی بال، فٹ بال، چہل قدمی، کثرت اپنی اپنی پسند کے مطابق طلبہ ان سب میں حصہ لیتے ہیں۔

نگراں ہاسٹل باقاعدہ نگرانی کرتے ہیں کہ کوئی طالب علم ان اوقات میں کمروں میں نہ لیٹا رہے۔

یہ باتیں سن کر سبھی حیرت زدہ رہ گئے، جامعۃ الفلاح کی برتری تو انہیں تسلیم کرنی نہیں تھی، البتہ میرا سامنا کرنے سے کترانے لگے۔

جامعۃ الفلاح اس وقت ہمارے علاقہ میں تقریباً گمنام تھا۔ میں نے سب سے پہلے اپنے چچازاد بھائی جاوید احسن فلاحی مدنی مرحوم کو داخلہ دلایا۔ یہ ۱۹۷۵ء ایمرجنسی کا زمانہ تھا۔ اس کے بعد اپنے چھوٹے بھائی اشفاق احمد فلاحی کو داخل کیا، پھر گاؤں اور قرب وجوار کے کئی طلبہ کو داخل کرایا۔ اس کے بعد ہمارے علاقہ سے جوق در جوق طلبہ کی آمد کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اور اب الحمدللہ ایک بڑی تعداد فارغین وفارغات کی ہے جو مختلف میدانوں میں اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھارہے ہیں اور مادر علمی کا نام روشن کررہے ہیں۔

جامعۃ الفلاح کی کئی شاخیں بھی کھل گئی ہیں، جن میں مصباح العلوم چوکونیاں، جامعۃ الصالحات بانسی، اور جامعۃ العلوم سفہٹی وغیرہ ہیں۔

۱۹۷۲ء میں جب جامعۃ الفلاح میں میرا داخلہ ہوا تھا اس وقت طلبہ کی تعداد بمشکل ۲۰۰ / رہی ہوگی اور اساتذہ کرام کی تعداد تقریباً بیس تھی۔ فارغین عالمیت کی تعداد ۲۳ / اور فارغین فضیلت کی تعداد ۵۰ / تھی۔ ۱۶۔۲۰۱۵ء سے موازنہ کیا جائے تو یہ تعداد اب کئی گنا بڑھ چکی ہے۔

اس وقت مجموعی تعداد طلبہ وطالبات ۴۶۹۰ (چار ہزار چھ سو نوے) ہے اور اساتذہ کی تعداد ۱۴۰ / (ایک سو چالیس) ہے۔ فارغین عالمیت کی تعداد اس وقت ۲۴۰۰ (دو ہزار چار سو) اور سند فضیلت حاصل کرنے والوں کی تعداد آٹھ سو سے زائد ہو چکی ہے، فارغات الگ ہیں۔

بانیان جامعہ کے خواب وخیال میں بھی نہیں رہا ہوگا کہ ۱۹۵۹ء میں قائم ہونے والا چھوٹا سا مکتب جو ۱۹۶۲ء میں جامعۃ الفلاح کی شکل اختیار کرگیا، وہ ۲۰۱۶ء تک اتنا بڑا ہو جائے گا، مگر مولانا مودودیؒ کی دوررس نگاہوں نے اسی وقت بھانپ لیا تھا۔ مولانا نے فرمایا تھا کہ ''جامعۃ الفلاح کے مؤذن نے حی علی الفلاح کی آواز اس زور سے لگائی ہے کہ مستقبل میں نمازیوں کی کثرت سے جامعہ کی مسجد کو تنگی کی شکایت ہوگی''۔

بات ہمارے زمانے کی چل رہی تھی، ۱۹۷۲ء میں جب میرا داخلہ ہوا اس وقت ناظم اعلی مولانا ابوبکر اصلاحی صاحب مرحوم تھے۔ مولانا کی شخصیت بہت ہی بارعب تھی۔ مولانا جماعت اسلامی کے نہ صرف رکن تھے بلکہ کئی اہم مناصب پر فائز رہ چکے تھے۔ انتہائی خلیق وملنسار تھے، تمام طلبہ سے انفرادی طور پر ان کے حالات معلوم کرتے رہتے۔ ۱۹۷۹ء میں جب میں فارغ ہوا اس وقت مولانا شعبہ اعلی کے صدرالمدرسین تھے، مولانا مرحوم کے بعد نومبر ۱۹۷۲ء میں مولانا عیسی صاحب حفظہ اللہ ناظم اعلی منتخب

ہوئے اور ہماری فراغت تک وہی ناظم اعلی تھے۔

ہمارے زمانے میں جامعہ کی حصار بندی نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی مین گیٹ بنا تھا۔ چاروں طرف سے کھلا ہونے کی وجہ سے مقامی لوگ اپنے جانور، بیل، بھینس وغیرہ لاکر میدان میں چراتے تھے۔ میں نے ایک آدمی کو منع کر دیا کہ اب یہاں جانور مت لانا فیلڈ خراب ہو جاتی ہے۔ دوسرے دن مولانا جلیل احسن ندویؒ کی ڈاک لینے انہی کی سائیکل سے پوسٹ آفس جارہا تھا۔ اس نے پیچھے سے ڈنڈے سے میرے اوپر حملہ کر دیا۔ میں سیدھے حکیم محمد ایوب صاحب مرحوم کے مطب پر پہنچا۔ مولانا کو اپنی پیٹھ پر ڈنڈے کا نشان دکھایا۔

مولانا نے کہا تم چلو میں آرہا ہوں۔ کچھ ہی دیر میں مولانا نے انتظامیہ کے لوگوں کو اکٹھا کر لیا۔ مودودی ہال سے مجھے بھی بلوایا گیا، اور اس لڑکے اور اس کے سرپرست کو بلایا گیا۔ اس وقت مولانا کا جلال قابل دید تھا۔ مولانا نے اس سے معافی منگوائی اور آئندہ میدان میں جانور نہ لانے کی ہدایت دی۔

میرے زمانہ قیام میں حسب ترتیب درج ذیل شخصیات جامعہ میں صدر رہیں:

(۱) مولانا عبدالحسیب اصلاحی صاحب	۱۹۷۱ء تا ۱۹۷۳ء
(۲) مولانا شبیر احمد اصلاحی مرحوم	۱۹۷۳ء تا ۱۹۷۷ء
(مولانا عبدالحسیب اصلاحی صاحب	۱۹۷۷ء تا ۱۹۸۰ء

ہمارے اساتذہ کرام میں اس وقت مولانا جلیل احسن ندوی صاحب مرحوم، مولانا محمد عنایت اللہ اسد سبحانی صاحب حفظہ اللہ، مولانا شبیر احمد اصلاحی صاحب مرحوم، مولانا عبدالحسیب اصلاحی صاحب حفظہ اللہ، مولانا صغیر احسن اصلاحی صاحب مرحوم، مولانا نظام الدین اصلاحی صاحب حفظہ اللہ، مولانا ابوبکر اصلاحی صاحب مرحوم، مولانا شہباز صاحب مرحوم (جامعہ چھوڑ کر ندوہ چلے گئے تھے)، مولانا سلامت اللہ اصلاحی صاحب حفظہ اللہ، انگریزی کے استاذ ماسٹر مناظر احسن صاحب مرحوم، اور انگریزی ومعاشیات کے استاذ ماسٹر سید عبداللہ صاحب حفظہ اللہ تھے۔

نوجوان فلاحی اساتذہ میں اس وقت مولانا رحمت اللہ اثری فلاحی صاحب حفظہ اللہ، مولانا ظفر احمد اثری فلاحی صاحب حفظہ اللہ، مولانا محمد عمران فلاحی صاحب حفظہ اللہ، اور مولانا مطیع اللہ فلاحی صاحب حفظہ اللہ تھے۔

معاشیات، سیاسیات اور ایجوکیشن کے استاذ ماسٹر اکرام الدین صاحب مرحوم اور ماسٹر عبدالحکیم صاحب مرحوم تھے جو شبلی کالج سے ریٹائرڈ ہو کر آئے تھے۔ اردو کے استاذ مولانا اقبال احمد قاسمی صاحب مرحوم اور ہندی کے استاذ ماسٹر جنید احمد صاحب مرحوم تھے۔

یہ تمام اساتذہ کرام اپنے سبجیکٹ کے ماہر، انتہائی مخلص اور محنتی تھے۔

ہمارے زمانے میں اساتذہ اور طلبہ کے درمیان ایک طرح کا روحانی رشتہ پایا جاتا تھا۔ استاذ کی حیثیت ایک روحانی باپ کی تھی۔ علم وعمل کے میدان میں وہ ایک شفیق نگراں کی حیثیت رکھتے تھے، جو طلبہ کے نجی معاملات تک میں دخیل ہوتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ طلبہ اپنے اساتذہ سے غیر تدریسی اوقات میں بھی استفادہ کرتے اور ان سے اخلاقی تربیت حاصل کرتے۔

میں ذاتی طور پر جن اساتذہ کرام سے زیادہ قریب رہا اور استفادہ کیا وہ تفسیر کے استاذ مولانا جلیل احسن ندوی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا محمد عنایت اللہ اسد سبحانی حفظہ اللہ ورعاہ تھے۔ انگریزی کے استاذ ماسٹر سید عبداللہ صاحب حفظہ اللہ اور ایجوکیشن وسیاسیات کے استاذ ماسٹر عبدالحکیم صاحب مرحوم تھے۔

ہمارے زمانے کے نوجوان فلاحی استاذ مولانا رحمت اللہ اثری فلاحی حفظہ اللہ کی شخصیت میرے لیے مثالی تھی۔ مولانا محترم کی سادگی، متانت، نیک نفسی، نرم خوئی، خدا ترسی، صبر وقناعت، زہد وتقوی، اور تبحر علمی کا ہر طالب علم قائل تھا۔ مادر علمی سے مولانا کی بے پناہ محبت اور اس کی تعمیر وترقی کے لیے بے مثال قربانیاں، طلبہ کے تئیں مشفقانہ و پدرانہ جذبات نے مجھے بے حد متاثر کیا۔

ایک دو واقعات جو ذہن کے پردے پر ہیں ان کا تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ غالباً ۱۹۷۳ء یا ۱۹۷۴ء کا زمانہ تھا۔ استاذ محترم جامعہ ہی کی کسی ضرورت سے الہ آباد تشریف لے گئے تھے۔ قیام غالباً ماسٹر اکرام الدین صاحب مرحوم کے یہاں تھا۔ ایک دیوار مولانا کے اوپر گر پڑی۔ مولانا اس کے نیچے دب گئے تھے۔ مولانا جب واپس آئے تو میں نے احوال جاننے کی کوشش کی۔ بتانے لگے کہ دونوں پسلیاں آپس میں مل گئی تھیں۔ شدت تکلیف کا اندازہ لگانا آسان ہے۔ اس وقت مولانا کی زبان سے نکلا ہوا ایک جملہ یاد آرہا ہے کہ مادر علمی کے لیے جان بھی چلی جائے تو کیا فرق پڑتا ہے۔

ایک دوسرا واقعہ ۱۹۷۵ء کا ہے جب ایمرجنسی لگ گئی اور جامعہ کے کئی اساتذہ کرام مع ناظم جامعہ وصدر جامعہ اور انتظامیہ وعاملہ کے ممبران کی بڑی تعداد سلاخوں کی پیچھے چلی گئی۔ جامعہ پر سناٹہ چھایا ہوا تھا۔ اساتذہ وطلبہ پر ہیبت طاری تھی۔ جماعت پر پابندی لگنے کی وجہ سے اندیشہ تھا کہ جامعہ میں تالا نہ لگ جائے۔ ایسے وقت میں مولانا رحمت اللہ اثری فلاحی صاحب نے جامعہ کی باگ ڈور سنبھالے رکھی۔ اور جب تک ایمرجنسی ختم نہیں ہوئی، نظامت وصدارت کی ساری ذمہ داریاں نبھاتے رہے۔

اعلی تعلیم کے حصول کے لیے مولانا جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ چلے گئے۔ فراغت کے بعد بحیثیت مبعوث مولانا کی تقرری جامعہ سلفیہ بنارس ہوگئی۔ مولانا کی کوشش تھی کہ مادر علمی جامعۃ الفلاح میں بعثت ہو جائے مگر نہیں ہوئی۔ دوبارہ کوشش ہوئی تو جامعہ اثریہ مئوناتھ بھنجن بھیج دیئے گئے۔ مادر علمی سے اس

قدر لگاؤ تھا کہ تنخواہ کی پرواہ کیے بغیر مولانا جامعہ چلے آئے، بعد میں منظوری بھی مل گئی۔

مولانا ستائش کی تمنا اور صلہ کی پرواہ کیے بغیر تا حال مادر علمی کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالی مولانا محترم کو صحت و عافیت کے ساتھ رکھے اور ان کے جذبات کو کبھی سرد نہ پڑنے دے، آمین

جہاں تک سوال قصبہ بلریا گنج کے افراد کے جامعہ کے ساتھ رویے اور جامعہ کی تعمیر و ترقی میں ان کے کردار کی ہے، ظاہری بات ہے کہ قصبہ بلریا گنج ہی کے لوگوں کے ذریعہ جامعۃ الفلاح کا قیام عمل میں آیا تھا۔ اور انہی کے بچے جامعہ سے استفادہ کر رہے تھے، تو ان کا رویہ مثبت ہی رہے گا۔ صرف قصبہ بلریا گنج ہی نہیں بلکہ پورے علاقے کے لوگ جامعہ کی تعمیر و ترقی میں گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ طلبہ و اساتذہ کو بڑے ہی احترام کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ جامعہ کی چھوٹی بڑی ضرورت کے تحت بلانے پر لوگ بڑی تعداد میں اکٹھا ہوتے تھے۔ جمعیۃ الطلبہ کے تحت کوئی پروگرام ہوتا تھا تو علاقہ کے لوگوں کی بھیڑ اکٹھا ہو جاتی تھی۔ یہ سب اس لیے تھا کہ جامعہ کی تیز رفتار ترقی کو دیکھتے ہوئے ہر کسی کو احساس ہو چلا تھا کہ یہ چھوٹا سا مدرسہ ایک دن آسمان دنیا پر روشن ستارہ بن کر چمکے گا۔ اس کے ذریعہ اس گمنام قصبے اور علاقے کا نام نہ صرف روشن ہوگا بلکہ نہایت ہی عزت و احترام سے لیا جائے گا۔

ہمارے زمانے کے مزید چند اہم واقعات کا تذکرہ ذیل کی سطور میں پیش ہے:

(۱) انجمن طلبہ قدیم کا قیام: میں فضیلت سال اول میں زیر تعلیم تھا۔ فارغین جامعہ کو مقاصد جامعہ سے ہم آہنگ کرنے اور مادر علمی سے شعوری طور پر ان کا رشتہ ہموار کرنے کی غرض سے استاذ محترم مولانا رحمت اللہ فلاحی صاحب کی صدا بعنوان ''بزم فلاح'' پر لبیک کہتے ہوئے ۴۲؍ فارغین جامعہ مادر علمی میں ۱۲؍ تا ۱۴؍ نومبر ۱۹۷۷ء کو جمع ہوئے۔

مادر علمی کے لائق فرزندوں کے والہانہ استقبال کی تیاریاں زور و شور سے چل رہی تھیں۔ برادر محترم مولانا انصار احمد فلاحی مرحوم، استاذ محترم مولانا رحمت اللہ اثری فلاحی حفظہ اللہ، استاذ محترم مولانا محمد عمران فلاحی حفظہ اللہ و دیگر فلاحی برادران کی سربراہی میں ہم طلبۂ جامعہ بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے۔

سابق امیر جماعت مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی سرپرستی و نگرانی میں انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح کی بنیاد ڈالی گئی اور اس کا دستور منظور کیا گیا۔

الحمدللہ اس کے ثمرات و برکات سب کے سامنے ہیں۔

(۲) حیات نو کا اجراء: جنوری۔ فروری ۱۹۷۸ء میں انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح کے ترجمان ''حیات نو'' کا اجراء برادر محترم و مکرم ڈاکٹر عبید اللہ فہد فلاحی صاحب اور برادر محترم جاوید اشرف فلاحی صاحب کی زیر نگرانی عمل میں آیا تھا۔ حیات نو کے پہلے شمارے میں اس ابتدائی کیفیت کو ان الفاظ میں

بیان کیا گیا:

''انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح کے آرگن کا پہلا شمارہ پیش کرتے ہوئے ہم انتہائی مسرت محسوس کرتے ہیں، اللہ تعالی کی اس عنایت اور مہربانی کے لیے ہم صمیم قلب سے شکرگزار ہیں''۔

(۳) یونیورسٹیوں سے الحاق: ۱۹۷۷ء میں ملک وبیرون ملک مختلف یونیورسٹیوں اور جامعات سے جامعہ کا الحاق شروع ہوگیا تھا، الحمدللہ اب تک تقریباً اندرون ملک دس جامعات نے جامعہ کی اسناد تسلیم کرلی ہیں، اور بیرون ملک ۶ ؍ یونیورسٹیوں نے فضیلت وعالمیت کی سند کو تسلیم کیا ہے۔

ہندوستان میں مدارس اسلامیہ کا بڑا جال بچھا ہوا ہے۔ سب میں طلبہ پڑھتے ہیں، اساتذہ پڑھاتے ہیں، سب کا اپنا نصاب ہے، سبھی عالمیت وفضیلت اور تخصص کی ڈگریاں تقسیم کرتے ہیں، یہ سلسلہ برسوں سے چلا آرہا ہے اور لامتناہی ہے۔ مدارس اسلامیہ کے درمیان جامعۃ الفلاح کو جو امتیاز حاصل ہے اس کے چار اسباب ہیں:

(الف) جامعہ کا نصاب تعلیم

(ب) طریق تدریس

(ج) نظام تربیت

(د) اظہار رائے کی آزادی

(الف) جامعہ کا نصاب تعلیم: عربی درجات میں عربی زبان وادب اور علوم اسلامیہ کے علاوہ عصری مضامین مثلاً انگریزی، معاشیات، سیاسیات، تاریخ وجغرافیہ، ایجوکیشن، اردو زبان اور ہندی زبان کا اضافہ کیا گیا ہے۔

اعلی درجات میں تفسیر، حدیث، عربی ادب کے ساتھ ساتھ ایجوکیشن اور معاشیات وغیرہ پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے۔

نصاب تعلیم میں اس بات کا خاص خیال رکھا گیا ہے کہ طلبہ قرآن وسنت کا گہرا علم حاصل کرنے کے ساتھ صحیح دینی بصیرت کے حامل ہوں اور ان کے اندر داعیانہ اوصاف پیدا ہوں۔

نصاب تعلیم میں عصری علوم کی شمولیت کا مقصد یہ ہے کہ فارغین جامعہ عصری علوم سے آراستہ ہوکر باطل افکار ونظریات کے مقابلہ میں اسلام کا دفاع کرسکیں اور اسلام کو بحیثیت نظام زندگی دلائل کے ساتھ پیش کرسکیں۔

(ب) طریق تدریس: عام مدارس وجامعات میں تدریس کا طریقہ تقلیدی ہے۔ طلبہ کو اسباق رٹائے اور یاد کرائے جاتے ہیں۔ استاذ کلاس میں جو کچھ پڑھاتے ہیں طلبہ اس کا نوٹ تیار کرتے ہیں۔

امتحانی پرچے بھی ویسے ہی تیار کیے جاتے ہیں اور طلبہ وہی رٹا رٹایا جواب لکھتے ہیں، اس سے ذہن وفکر میں وہ بالیدگی نہیں آتی جو مطلوب ہے۔ اس کے بالمقابل جامعہ میں تدریس کا طریقہ استخراجی اور تخلیقی ہے۔ اس طریق تعلیم سے اساتذہ کے ساتھ ساتھ طلبہ بھی درس سے پہلے مطالعہ کر کے آتے ہیں اور مشکل الفاظ لغت کے ذریعے حل کر کرے آتے ہیں۔ استاذ کا کام تصویب وتسہیل کا ہوتا ہے۔ اس طریق تدریس سے طلبہ کے اندر فہم وادراک کی صلاحیتیں پروان چڑھتی ہیں، ان کے اندر علمی وتحقیقی رجحان کے ساتھ ساتھ خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے۔

(ج) نظام تربیت: ہندوستان کے بہت سے دینی مدارس میں جانے اور وہاں کے نظام تعلیم وتربیت کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ الحمدللہ ثم الحمدللہ جامعہ جیسا تربیتی نظام میں نے کہیں نہیں دیکھا۔

ہمارے یہاں طلبہ کی تعلیمی صلاحیت کو پروان چڑھانے کے ساتھ ساتھ ان کی اخلاقی تربیت پر بھی خصوصی توجہ دی جاتی ہے۔

اساتذہ کے علاوہ ہاسٹل میں بھی نگراں مقرر ہوتے تھے جو طلبہ کے اٹھنے بیٹھے، سونے جاگنے، مطالعہ کرنے، غرضیکہ کلاس روم سے لے کر کھیل کے میدان تک، اور لائبریری سے لے کر مسجد اور بازار تک، ان کی عقابی نگاہیں طلبہ کے ایک ایک عمل کی نگرانی کرتی تھیں۔ معمولی معمولی کوتاہی پر بھی کبھی انفرادی تو کبھی اجتماعی اصلاح کی جاتی تھی۔ نماز کے بعد کبھی مولانا شبیر احمد اصلاحی مرحوم تو کبھی مولانا صغیر احسن اصلاحی مرحوم طلبہ کی کمیوں اور کوتاہیوں کی نشاندہی کرتے۔ تو کبھی خطبہ جمعہ میں مولانا محمد عنایت اللہ اسد سبحانی صاحب گرجدار آواز اور مخصوص انداز میں طلبہ کو نصیحت کرتے اور ان کے اندر نیا جوش وولولہ پیدا کرتے۔

(د) اظہار رائے کی آزادی: دینی مدارس میں عموماً طلبہ اور اساتذہ کو ایک فکر پر باندھ کر رکھا جاتا ہے اور اختلاف رائے کو برداشت نہیں کیا جاتا جس کی وجہ سے کسی دوسرے نقطۂ نظر کو سامنے آنے کا موقع نہیں ملتا۔ اس کے برخلاف جامعہ میں اظہار رائے کی مکمل آزادی تھی۔ مختلف مسائل میں طلبہ اپنے مطالعہ وتحقیق کی بنا پر اساتذہ سے اختلاف کرتے تھے۔ اساتذہ کرام نہ صرف ان کی رایوں کا احترام کرتے تھے بلکہ ان کی حوصلہ افزائی بھی کرتے تھے۔ اس سے طلبہ میں علم وتحقیق اور طلب وجستجو کی اسپرٹ پیدا ہوتی تھی۔ یہ وہ صفات ہیں جن کی بنا پر ہم کہتے ہیں کہ ؎

ہے ہمالہ سے بھی اونچا مرا مینار فلاح

خطبۂ مدراس

چار نکاتی لائحہ عمل (۴/۴)

▫ زیر نظر شمارے میں مولانا مودودی علیہ الرحمہ کے مشہور ومعروف خطبۂ مدراس میں پیش کردہ چار نکاتی لائحہ عمل میں سے چوتھے نکتے کو زیربحث لایا گیا ہے۔ یہ خطبہ تقسیم ہند کے بعد یہاں رہ جانے والے مسلمانوں کے لیے کچھ رہنما خطوط پیش کرتا ہے۔

▫ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع سے پہلے مولانا مودودیؒ کی اصل تحریر کو پیش کردیا جائے، اس کے بعد اس پر ہوئی گفتگو پیش کی جائے۔

▫ ذیل کی سطور میں اس نکتے پر اچھی اور مفید گفتگو کی گئی ہے، امید کی جاتی ہے کہ اس سے ہمارے درمیان ایک سنجیدہ علمی بحث کا آغاز ہوگا۔ (مدیر)

...... چوتھا نکتہ ......

چوتھا ضروری کام یہ ہے کہ ہمارے سب کارکن اور وہ تمام لوگ جو آئندہ ہماری تحریک سے متأثر ہوں۔ ہندوستان کی ان مقامی زبانوں کو سیکھیں اوران میں تقریر وتحریر کی قابلیت بہم پہنچائیں جو آئندہ تعلیم اورلٹریچر کی زبانیں بننے والی ہیں۔ اوراس امر کی انتہائی کوشش کریں کہ ان زبانوں میں جلدی سے جلدی اسلام کا ضروری لٹریچر منتقل کردیا جائے۔ جنوبی ہند میں تامل، تلنگی، کنڑی، ملیالم اورمرہٹی، مغربی ہند میں گجراتی، مشرقی ہند میں بنگلہ اور باقی ہندوستان میں ہندی اب تعلیم کی زبانیں ہوں گی۔ یہی اپنے اپنے علاقوں میں دفتری اورسرکاری زبانیں بھی ہوں گی اورانہی میں ملک کا لٹریچر شائع ہوگا۔ اگر مسلمان اپنی قومی عصبیت کی بناپر صرف اردو تک اپنی تحریر وتقریر کو محدود رکھیں گے تو ملک کی عام آبادی سے بیگانہ ہوکر رہ جائیں گے اوران کے پاس اپنے کروڑوں ہمسایوں کو اپنا ہم خیال بنانے کا کوئی ذریعہ نہ رہے گا۔ بلاشبہہ ہم یہ ضرور چاہتے ہیں کہ اردو زبان نہ صرف باقی رہے بلکہ فروغ پائے۔ کیونکہ ہمارا اب تک کا سارا سرمایۂ علم وتہذیب اسی زبان میں ہے، لیکن ہم اسلام کے مستقبل کو اردو زبان کے دامن سے باندھ دینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اگر اردو زبان ملک کی عام زبان نہیں بن سکتی، اور آثار یہی بتارہے ہیں کہ اس کو یہ حیثیت حاصل نہ ہوگی۔ تو پھر جن جن زبانوں کو ملک میں رواج حاصل ہوگا، ہم ان سب میں اسلام کا لٹریچر مہیا کریں گے اوران سب کو اسلام کی دعوت وتبلیغ کے لیے استعمال کریں گے۔ ایسا کرنا محض غیر مسلموں ہی کی خاطر نہیں بلکہ خود مسلمانوں کی آئندہ نسلوں کو بھی مسلمان رکھنے کی خاطر ضروری ہے، کیونکہ آگے چل کر مسلمان بچے درسگاہوں میں تعلیمی زبان اوردرسگاہوں سے باہر سرکاری اورملکی زبان سے اس قدر متأثر ہوں گے کہ اردو سے ان کا تعلق برائے نام رہ جائے گا، اوراگر ان زبانوں میں کافی اسلامی لٹریچر نہ ملا تو وہ بالکل اکثریت کے رنگ میں رنگتے چلے جائیں گے۔

(**خطبۂ مدراس**، سید ابوالاعلیٰ مودودی علیہ الرحمہ، صفحہ ۳۶/۳۷)

● **نسیم احمد غازی فلاحی**، سکریٹری اسلامک ساہتیہ ٹرسٹ، نئی دہلی،
موبائیل نمبر :09213134150

تقسیم ملک کے بعد ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمانوں بالخصوص تحریک اسلامی کے افراد کو مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے مسلمانوں کی بقاواستحکام نیز اسلام کے امت مسلمہ پر عائد کردہ نصب العین کی حصولیابی کے لیے جو حکیمانہ اور دوراندیشی پرمبنی مشورے بلکہ لائحہ عمل خطبۂ مدراس کے نام سے عنایت فرمایا۔ اس کے سرسری سے مطالعے سے بآسانی یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مولانا مودودیؒ پر اللہ کا خاص فضل تھا اور وہ اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کے حقیقی جانشین تھے۔ ان کی زندگی کا مقصد عین اسلام کی ہدایتوں کے مطابق تھا۔

مولانا مرحوم نے خطبہ مدراس میں جو کچھ فرمایا اس سے کسی کو جزوی اختلاف تو ہوسکتا ہے لیکن اس کی روح اور اسپرٹ سے اختلاف کی گنجائش نہیں۔ مولانا نے ہندوستانی مسلمانوں اور تحریک اسلامی ہند کو جو مشورے دیئے ان کو چار نکات میں بیان فرمایا۔ جن میں سے تین پر مختلف احباب وحضرات نے اظہار خیال کیا اور اب اس مضمون میں چوتھے نکتے پر اظہار خیال کرنا ہے۔ ان سبھی نکات کا آپس میں گہرا منطقی وعملی ربط ہے اور سب کا مقصد ایک ہے اور وہ یہ کہ مسلمان اور تحریک اسلامی قرآنی نصب العین ''دعوت الی اللہ'' شہادت حق اور دعوت الی الخیر کے فریضے کو پوری یکسوئی اور خلوص کے ساتھ انجام دیں کیونکہ اسی قرآنی نصب العین کو اختیار کرنے میں امت مسلمہ کی بقاواستحکام نیز اس کی عزت واحترام کا انحصار ہے۔ اگر ملت اس قرآنی نصب العین کو اختیار نہیں کرتی تو پھر خود قرآن کی نظر سے ملت کو باقی رہنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ یہ ایک نہایت سنجیدہ بلکہ زندگی کا اہم ترین مسئلہ ہے جس پر غور کرنا اور صحیح فیصلے تک پہنچنا دنیا اور آخرت کی کامیابی کے لیے ضروری ہے۔

چوتھے نکتے میں مولانا نے اسلام کی قولی گواہی کی طرف رہنمائی کی، وہ اس طرح کہ ملت اسلامیہ بالخصوص تحریک اسلامی ہند اپنا ضروری، اہم اور مفید اسلامی لٹریچر ہندوستان کی علاقائی زبانوں بشمول ہندی میں جلد از جلد منتقل کریں اور عوام الناس تک اسے پہنچائیں۔ لوگوں کی اپنی زبان میں تحریری اور تقریری طور پر اپنا پیغام پہنچانا ہر اس شخص، ادارے اور ملت وتنظیم کا اہم ذریعہ رہا ہے جو اپنے مشن کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے سنجیدہ ہے۔ حال یہ ہے کہ باطل پرستوں اور حق کے مخالفوں نے اپنے مذموم مقاصد کے حصول کے لیے اس میدان میں بڑی جدوجہد کی اور قربانیاں دیں تو پھر بھلا دین حق کے علمبرداروں کے لیے اس میدان میں کوتاہی کیونکر مفید ہوسکتی تھی۔ کیا ہمیں نہیں معلوم کہ دین حق کے مخالفوں نے کتنی جاں فشانی کے بعد عربی زبان میں مہارت حاصل کی اور اپنے مذموم عزائم کے حصول کے لیے انہوں نے ایسا کیا اور انہیں اس میں بڑی کامیابی بھی ملی۔

مولانا مودودیؒ نے اسی اہمیت کے پیش نظر مشورہ اور ہدایت دی کہ ہندوستانی مسلمان یہاں کی علاقائی زبانوں میں مہارت حاصل کریں اور اسلام کو لوگوں کی زبان میں پہونچائیں۔لیکن بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مسلمانوں نے اس سلسلے میں مجرمانہ غفلت کا ثبوت دیا۔ایک عرصے تک بلکہ آج بھی بڑی حد تک ہمارے دینی مدارس علاقائی زبانوں سے متنفر ہی رہے، چنانچہ ان مدارس سے علماء کی جو کھیپ کی کھیپ نکلی وہ ہندی، انگریزی اور دیگر زبانوں سے نابلد تھی۔مسلمانوں کے عوام کا بھی حال ایسا ہی تھا۔انہوں نے ہندی، انگریزی اور دیگر زبانیں سیکھیں بھی تو ان کا مقصد عام طور پر حصول معاش ہی رہا، خدمت دین نہیں۔

جہاں تک تحریک اسلامی ہند کا تعلق ہے تو اس نے شروع دن ہی سے ہندی زبان میں اسلام کے پیغام کو پہنچانے کی طرف توجہ دی، جس کے واضح اور بین ثبوت جماعت کی روداد میں ہیں جن کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ جماعت اس سلسلے میں فکرمند و متحرک رہی۔ یہ اور بات ہے بوجوہ ابتدائی دور میں بہت زیادہ کام نہیں ہوسکا۔ جماعت نے چند بنیادی کتابوں کے ترجمے خصوصاً ہندی میں شائع کیے نیز ہندی زبان ہی میں کانتی کے نام سے رسالہ خالص دعوتی مقاصد سے جاری کیا۔ کیونکہ اس وقت ان کاموں کے علاوہ ملک میں کسی دوسری جگہ ہندی میں کوئی قابل ذکر کام نہیں تھا، اس لیے ان کاموں کی بڑی پذیرائی ہوئی۔

ایمرجنسی کے بعد غالباً ۱۹۸۰ء کے آس پاس اس وقت کے امیر جماعت مولانا محمد یوسف صاحبؒ نے ایک زبردست خدمت یہ انجام دی کہ انہوں نے ملک کی علاقائی زبانوں میں خود انہی کے حلقوں میں دارالاشاعت قائم کرنے کا انتظام کیا اور ترجیحی بنیاد پر ان سبھی زبانوں میں قرآن مجید کے ترجمے شائع کرائے۔ الحمدللہ یہ سبھی دارالاشاعت اس وقت سے اسلامی لٹریچر کی اشاعت کی خدمت انجام دے رہے ہیں اور یقیناً یہ جماعت اسلامی کی ایک عظیم خدمت ہے جسے کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

ہندی زبان میں علیحدہ سے کوئی دارالاشاعت نہیں تھا، البتہ ہندی کتابیں جماعت کے مرکزی مکتبہ سے ہی شائع کی جاتی تھیں۔ میں بھی جامعۃ الفلاح سے فراغت کے بعد اس وقت مرکز جماعت سے منسلک ہوگیا تھا۔میرے ذمے برادران وطن میں دعوتی کام اور ہندی لٹریچر کی تیاری کا کام تھا۔

۱۹۹۴ء میں مولانا سراج الحسن صاحب مدظلہ کے دور امارت میں ایک عظیم کام یہ انجام دیا گیا کہ ہندی کتابوں کی تیاری، طباعت اور اشاعت کے لیے دہلی ہی میں اسلامی ساہتیہ ٹرسٹ کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا گیا، جس کی ذمہ داری میرے سپرد کی گئی۔اس وقت سے آج تک یہ ادارہ پوری یکسوئی اور توجہ کے ساتھ اپنے کام میں لگا ہوا ہے۔

ابتدا میں اسلامی ساہتیہ ٹرسٹ کے ذریعے ہندی کتابوں کی تیاری کے ساتھ ساتھ ان کی طباعت

اوراشاعت کی خدمت بھی انجام دی جاتی تھی لیکن بوجوہ ۲۰۰۰ء میں اس ٹرسٹ کے ذمے صرف ہندی کتابوں کی تیاری اور کمپوزنگ وغیرہ کام رہا، اور طباعت واشاعت حسب سابق مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز کے سپرد کردی گئی۔

خصوصاً تنظیموں میں تنظیموں کے ذمہ داران کے مزاج، رویے اور ان کے ذوق وشوق کا اثر تنظیموں کے کاموں کو متأثر کرتا ہے۔ بہرحال ہندی کا یہ ادارہ اپنا کام تو انجام دیتا رہا لیکن بعض بااثر ذمہ داروں کے اپنے مخصوص رویے اور مزاج کی وجہ سے ہندی کا کام اس تیزی سے نہیں بڑھ سکا، جیسا کہ بڑھنا چاہیے تھا۔ پھر پچھلی دو میقاتوں سے جب سے مولانا سید جلال الدین عمری صاحب جماعت اسلامی کے امیر بنے اس کے بعد سے اس ہندی ادارے کے نسبتاً اچھے دن شروع ہوئے۔ مولانا موصوف کی مرکزی ٹیم نے اپنی آغوش وا کی اور ہندی میں اسلامی لٹریچر تیار کرنے والے اس ادارے کے حوصلے بلند ہوئے۔ چنانچہ پچھلے ۸/سے ۱۰/سالوں میں کافی کتابیں ہندی زبان میں شائع ہوئیں۔ الحمدللہ یہ سلسلہ جاری ہے اور امید ہے کہ ان شاءاللہ اس میدان میں آئندہ مزید ترقی ہوگی۔ ہندی میں اس وقت تقریباً ۴۰۰/ٹائٹل شائع ہوچکے ہیں جن میں تفہیم القرآن حصہ اول، دوم، تلخیص تفہیم القرآن مکمل، ترجمہ قرآن مع مختصر حواشی کے دو ہندی ایڈیشن، کلام نبوت مکمل، اسلام کی دعوت، محمد عربیؐ، آداب زندگی، پردہ، رودادیں، اور بہت سی دیگر اہم کتابوں کے ہندی ترجمے کی اشاعت قابل ذکر ہے۔

یہاں اس بات کا بھی ذکر مناسب ہوگا کہ حالات اور ضرورت کے پیش نظر بعض دیگر لوگوں نے بھی ہندی میں اسلامی کتابوں کی اشاعت کی خدمت انجام دی ہے، نیز جماعت کے کچھ ادارے بھی اس خدمت میں لگے ہوئے ہیں جن میں مدھر سندیش سنگم قابل ذکر ہے۔

مولانا مودودیؒ نے اس ضمن میں اس بات کی طرف توجہ دلائی ہے اور وہ خاص طور سے یہ ہے کہ یہ دعوتی اور اشاعتی کام جلد از جلد اور مؤثر انداز میں کام کیا جائے۔ ہمیں جو بات کھٹکتی ہے وہ یہ ہے کہ کتابیں تو شائع ہوتی ہیں، مگر انہیں عوام الناس تک پہنچانے کا مؤثر اور فعال طریقہ ہمارے پاس نہیں ہے، اس کی ایک وجہ ان کتابوں کی بڑھتی ہوئی قیمت ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قیمت متعین کرتے وقت دعوتی اور تحریکی ضرورت کے مقابلے کاروبار اور تجارت کو مقدم رکھا جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے خود جماعت کا کیڈر اور عام لوگ بھی ان کتابوں کو خرید کر لوگوں تک پہنچانے میں قاصر رہتے ہیں۔

مولانا مودودیؒ کی ہدایت اور خواہش بلکہ موجودہ حالات اور دعوتی تقاضوں کے پیش نظر اس ضمن میں چند مشورے دینا مناسب معلوم ہوتا ہے تاکہ تحریک کے ذمہ داران اور ملت کے دردمند اور حساس لوگ ان پر غور کریں؛

(۱) ہمیں پورے ملک میں بنیادی اور اہم اسلامی لٹریچر بشمول تراجم قرآن وحدیث نہایت کم

ہدیے پر فراہم کرنا چاہیے، تاکہ جو لوگ دعوتی کام کرنا چاہتے ہیں انہیں کتابوں کی حد تک بھرپور سہولت ملے۔ ممکن ہے یہ کام بغیر کسی منافع کے کرنا پڑے یا پھر ان کتابوں پر سبسڈی دینی پڑے۔ الحمدللہ جماعت اور ملت بہت سی ایسی خدمات انجام دیتی ہے جن میں صد فیصد سبسڈی دی جاتی ہے اور کسی طرح کے کاروبار کا تصور بھی ان میں نہیں ہے۔ مثلاً مدارس کو چلانا، مساجد کی تعمیر اور توسیع نیز دیگر رفاہی اور فلاحی کام۔ ہمارے خیال میں کتابوں کی ترسیل اور فراہمی کا یہ کام بہت پہلے ہونا چاہیے تھا مگر اب بھی جتنی جلد شروع کر دیا جائے خود ہمارے حق میں بہتر ہوگا۔ ان کے لیے خصوصاً جماعت کی جانب سے اقدام ہونا چاہیے اور کسی ادارے کے ذمہ دار یا بعض افراد کے اپنے ذوق وشوق اور ان کی دلچسپی پر اس کام کو نہیں چھوڑنا چاہیے۔

(۲) ہمیں اپنے دینی مدارس کو آمادہ کرنا چاہیے کہ وہ اپنے نصاب تعلیم میں موجودہ حالات اور ضرورت کے پیش نظر ایسی چیزیں شامل کریں جن سے ہمارے ہمارے طلبہ کے اندر انسانیت کو تباہی اور بربادی سے بچانے کی داعیانہ تڑپ پیدا ہو اور وہ یہاں سے فارغ ہونے کے بعد انسانی سماج کے اندر اپنا اسلامی کردار ادا کریں۔ اسی ضمن میں ہمارے مدارس کو اپنے طلبہ کے اندر علاقائی زبان سیکھنے کا احساس پیدا کرنا چاہیے بلکہ ہمارا مشورہ ہوگا کہ کچھ موضوعات کا میڈیم ہندی ہونا چاہیے۔

(۳) اپنے ہونہار نوجوانوں کے اندر اس میدان میں دین کی خدمت کا جذبہ پیدا کرنا چاہیے اور اس کے لیے ان کے سامنے کوئی لائحہ عمل پیش کیا جانا چاہیے۔ جو نوجوان مخلصانہ طور پر اپنے آپ کو اس کام میں لگانا چاہیں ان کی رہنمائی اور ان کے تعاون کے لیے کوئی اجتماعی نظم ضروری ہے۔ اگر اس کام کی اہمیت کو محسوس کیا جائے تو اس قسم کے نظم کا قیام کوئی مشکل نہیں ہے۔

● **رضوان احمد فلاحی**، لندن، ای میل:
rizwanfalahi@hotmail.com

قائد تحریک نے جس چوتھے اور آخری نکتہ کی جانب توجہ دلائی تھی وہ اولین تینوں نکتوں کی مانند بہت اہمیت کا حامل ہے۔ تقسیم ہند کے زمانے میں حالات جس رخ پر لے جائے جا رہے تھے اس سے یہ بالکل عیاں تھا کہ آزاد ہندوستان کا جو نقشہ ابھر کر سامنے آئے گا اس میں ان معاشرتی، تمدنی اور تہذیبی مظاہر کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوگی جن کا تعلق کسی بھی درجے میں اسلام اور مسلمانوں سے ہے۔ چنانچہ عملاً یہی ہوا اور یہی ہو رہا ہے۔ اردو ہندوستان کی تنہا وہ زبان تھی جو ملک کے ہر حصے میں بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ لیکن چونکہ اس کے دامن کا غالب حصہ اسلام اور اہل اسلام سے وابستہ تھا، اس لیے ملک کے معماروں نے چابک دستی سے ایسی لسانی پالیسی تشکیل دی کہ یہ زبان اپنی ہی جنم بھومی میں بے یار و مددگار

ہوکر رہ گئی۔ اس کا معاش سے براہ راست رشتہ نہ ہونے کی وجہ سے اردو دانوں کی آل اولاد دوسری زبانوں کی طرف لپکنے پر مجبور ہوگئی۔ اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ نئی نسل کا بڑا حصہ اس سرمایہ علم وتہذیب سے بے گانہ ہوتا چلا گیا جو اردو زبان میں ہے۔ بیدار مغز مستقبل بیں قائد نے چوتھے نکتے میں اسی خطرے کی جانب توجہ دلاتے ہوئے کہا تھا کہ گو کہ ہماری خواہش ہے کہ اردو زبان نہ صرف باقی رہے بلکہ فروغ پائے کیونکہ ہمارا اب تک کا سارا سرمایہ علم وتہذیب اسی زبان میں ہے، اس کے ساتھ ہی انہوں نے حقیقت پسندی کا ثبوت دیتے ہوئے یہ بھی کہا کہ ہندوستان میں اسلام کا مستقبل صرف اردو سے باندھ دینا غیر دانشمندانہ روش ہوگی۔ ملک میں اور بھی زبانیں ہیں جن کے بولنے والے مسلم وغیر مسلم سبھی ہیں۔ دعوت کا تقاضا ہے کہ مخاطب کو دعوت اس زبان میں پہنچائی جائے جسے وہ بخوبی سمجھتا ہو، اس میں مسلم اور غیر مسلم کی کوئی تخصیص نہیں۔ چنانچہ اس کی اہمیت کے پیش نظر ان کا مشورہ تھا - اور بہت صائب مشورہ تھا - کہ تحریکی افراد نہ صرف دیگر زبانیں سیکھیں اور ان میں تحریر وتقریر کی صلاحیت بہم پہنچائیں بلکہ جتنی جلد ممکن ہو اسلام کا بنیادی لٹریچر ان زبانوں میں منتقل کر دیا جائے تاکہ ان کے بولنے والوں تک اسلام کا آفاقی پیغام ان کی اپنی زبانوں میں پہنچ سکے۔

زبانیں وسیلۂ اظہار ہیں، نہ کہ بجائے خود کوئی مقصد۔ مقصود دعوت پہنچانا ہے۔ مقصود کی تکمیل میں زبان کی رکاوٹ ہرگز حارج نہیں ہونی چاہیے۔ اس کا عملی مشاہدہ برطانیہ میں بخوبی ہوتا ہے۔

برطانوی حکومت کی پالیسی یہ ہے کہ وہ حکومتی ادارے جن کا راست تعلق عوامی فلاح و بہبود سے ہے، جیسے صحت، تعلیم اور دیگر سماجی شعبے، ان کے بارے میں معلومات عوام تک براہ راست پہنچنی چاہئیں۔ ملک کی آبادی کا ایک بڑا حصہ جو دیگر ممالک سے آیا ہوا ہے اور اب یہاں کا باشندہ ہے اور انگلش کے علاوہ دیگر زبانیں بولتا ہے، حکومت کی پالیسی یہ ہے کہ مطلوبہ معلومات ان کی اپنی زبانوں میں پہنچیں۔ چنانچہ یہ معلومات انگلش سے ترجمہ ہوکر ایشیائی وغیر ایشیائی زبانوں میں عام کی جاتی ہیں۔ عوامی بہبود سے متعلق کوئی نئی سرکاری پالیسی وجود میں آتی ہے اور چند دنوں کے اندر دیگر زبانوں میں بھی دستیاب ہوجاتی ہے تاکہ کوئی بھی انگلش نہ جاننے کے سبب اس پالیسی کے تئیں ناواقف نہ رہے۔ جب دنیاوی معاملات میں انتفاع کو کسی ایک زبان کے دامن سے باندھا نہیں جاسکتا ہے تو اس معاملہ کو کیسے باندھ جاسکتا ہے جس سے دنیا و دین، دونوں کی فلاح وابستہ ہے۔

یہ امر موجب اطمینان ہے کہ تحریک اسلامی ہند نے اول روز سے اس جانب پوری توجہ کی ہے اور ہندوستان کی تمام قابل ذکر زبانوں میں داعیوں کی ٹیم کے ساتھ بنیادی اسلامی لٹریچر بھی فراہم کر دیا ہے اور یہ محمود کوشش مستقل جاری ہے۔ اس باب میں شاید ہی کوئی اس کا مدمقابل ہو۔

زبیر ملک فلاحی، لکھنؤ۔موبائل نمبر:09889650087ای میل:
zubairmalikfalahi@gmail.com

اللہ تعالیٰ غریق رحمت کرے اور کروٹ کروٹ جنت دے مولانا مودودیؒ کو، خطبہ مدراس کی اس شق میں بڑی اہم بات کہی ہے۔ یہی وہ ہندوستان ہے جہاں کبھی انگریزی کی تعلیم تقریباً کفر سمجھی جاتی تھی۔ ندوہ جو روشن خیالی کی بنیاد پر قائم ہوا تھا اور قدیم نافع اور جدید صالح جس کی اساس تھی وہاں مولانا شبلی کو ناکوں چنے چبانے پڑے پھر بھی بات نہ بن سکی۔ اسی ہندوستان میں مولانا مودودی کی یہ سفارشات واضح کرتی ہیں کہ ان کا فہم دین کیا تھ اور دینی حقائق، دعوتی مسالح اور اس شاہراہ کے جملہ نشیب وفراز ان پر کس قدر واضح تھے۔ علی گڑھ نے بھی جدید تعلیم کی بات کی تھی لیکن کس لیے؟؟ بیشک ایک مومن کی غیرت ایمانی یہی تقاضا کرتی ہے کہ وہ ہر حال میں زبان قال اور زبان حال سے یہی کہے:

انّ صلوتی ونسکی ومحیای ومماتی لله رب العالمین۔

یہ دراصل مولانا مودودیؒ کے شعوری مطالعہ قرآن کا نتیجہ تھا کہ قرآن کی صورت میں انہیں ایسی شاہ کلید ہاتھ آ گئی تھی کہ مسائل حیات کے جس تالے میں بھی یہ چابی لگاتے وہ فی الفور کھل جاتا اور حقیقت سامنے کھڑی نظر آتی۔

قرآن میں انبیاء کرام کی یہ ذمہ داری بیان کی گئی ہے کہ وہ کھول کھول کر حق کو بیان کر دیں۔ تبیین کا لفظ آیا ہے۔ اس کا لازمہ ہے کہ مدعو کو اس کی زبان میں سمجھا جائے۔ قرآن نے اپنے بارے میں ''بلسان مبین'' کہا ہے۔ کوئی بھی زبان صرف الفاظ کا مجموعہ نہیں ہوتی بلکہ بولنے والے کی تہذیب وتمدن، اس کے معتقدات، اس کی نفسیات اور مزاج، اس کے رویوں، پسند و ناپسند کا مظہر اور اس کی حس جمالیات کا آئینہ ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فرد بھی اور پوری قوم بھی اس کے سلسلے میں بڑی حساس ہوتی ہے۔ یہ لوگوں کو جوڑتی بھی ہے اور کاٹتی بھی ہے۔ یہ وجہ محبت ویگانگت بھی ہوتی ہے اور باعث نفرت وانتشار بھی۔ یہ شیرازہ قوم بھی ہوتی ہے اور وجہ امتیاز بھی۔

یہ عام انسانی معاشرے کی حقیقت ہے۔ لیکن وہ دین جو وحدت انسانیت کا علم بردار ہو اور فکر وخیال اور شعور واحساس کی عظیم بلندیوں تک لے جانا چاہتا ہو، وہ بھلا زبان کی بنیاد پر انسانیت کی تقسیم کیسے گوارا کر سکتا ہے۔ فطری طور پر وہ ساری زبانوں کو افکار ومعانی کی ترسیل وابلاغ کا ایک ذریعہ محض باور کرتا ہے اور بس۔ وہ انسانی تمدن کی ساری حاصلات کو احقاق حق اور ابطال باطل کا خادم اور چاکر سمجھتا ہے۔ اب جسے اس مقام بلند پر فائز ہونا ہو اور اس کار عظیم کو انجام دینا ہو وہ اپنے آپ کو اسی سانچے میں ڈھالے۔ میری سمجھ سے مولانا مودودی نے یہی بات سمجھائی ہے۔ خطبہ حجۃ الوداع میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں عربی عجمی کی فضیلت کی تردید فرمائی ہے وہاں دراصل اسی حقیقت کو سمجھایا ہے۔

یہ تو اصولی بات تھی، لیکن ان کمزوریوں پر قابو پانے کے لیے بڑا ہی دل وجگر کی ضرورت ہوتی ہے کہ آدمی صاف کہہ دے کہ انی ذاهب الی ربی سیهدینی۔

یہ چیز کتنی مشکل ہے، یہ تصویریں ملاحظہ کیجیے:

خود مولانا مودودیؒ جب پاکستان تشریف لے گئے تو پاکستان میں کئی زبانیں موجود تھیں۔ پنجابی، سندھی، بلوچی، پشتو اور بنگالی۔ پاکستان میں قومی زبان کی تعیین کی تاریخ سے اگر آپ واقف ہوں تو معلوم ہوگا کہ وہاں کی سیاست کا یہ اچھا خاصا مسئلہ تھا۔ اردو وہاں کی سرکاری زبان قرار پائی اور جہاں تک مجھے یاد ہے کہ مولانا مرحوم کا بھی یہی موقف تھا۔ مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش بنانے میں لسانی تعصب یا عصبیت کہہ لیجیے، کے ہاتھ ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

میں معاشی ضرورت کے تحت چند ماہ ابوظہبی میں رہ چکا ہوں۔ لسانی حوالے سے دو واقعات وہاں میرے ساتھ پیش آئے۔ ایک صاحب جن کے والدین مہاجر تھے، نے مجھ سے ملنے کے لیے وقت مانگا۔ میں نے کہا فرمائیے، کہنے لگے کہ ایک اہم بات کرنی ہے چلئے ہوٹل میں، وہاں بات کریں گے، چنانچہ ہم چائے خانے گئے۔ وہاں وہ پوچھنے لگے کہ آپ جو زبان بولتے ہیں کیا آپ کے گھر میں بھی لوگ ایسے ہی بولتے ہیں۔ میرا جواب ظاہر ہے ہاں ہی تھا۔ میں نے کہا کہ جس اہم بات کے لیے آپ یہاں مجھے لائے ہیں وہ پوچھئے۔ کہنے لگے کہ بس یہی پوچھنا تھا۔ ہم لوگ بھی اردو بولتے ہیں لیکن ۔۔۔۔ یہ کہہ کر وہ دور خلا میں دیکھنے لگے۔ میں سمجھ گیا کہ شاید وہ اپنے اور اپنے والدین کے ماضی میں کھو گئے اور یہ ساری باتیں زبان کے حوالہ سے ان کے ذہن میں آئی ہیں۔

وہیں ایک دوسرے صاحب پنجاب کے کسی علاقے کے تھے۔ وہ اپنے کسی دوسرے پنجابی ساتھی سے پنجابی میں باتیں کر رہے تھے۔ میں بھی ساتھ تھا۔ کسی بات پر میں نے انہیں پنجابی میں ٹوک دیا۔ وہ ایک لمحہ ٹھہرے اور پھر مجھے اپنی بانہوں میں دبوچ لیا۔ خوشی کے مارے پاگل ہوئے جا رہے تھے کہ مجھے بھی پنجابی آتی ہے اور پھر سارے عرصہ قیام مجھ پر بہت مہربان رہے۔

قومی مظاہر نے کیا کیا گل کھلائے ہیں ہر کس و ناکس کو معلوم ہے۔ ہندوستان پر مسلمانوں کی حکومت کے نتیجے میں جہاں تاج محل اور لال قلعہ وغیرہ وجود میں آیا وہیں اردو زبان بھی ایک نتیجہ سمجھی جاتی ہے۔ تفاخر کی اسی نفسیات کا ایک حصہ اردو زبان بھی ہے۔

ایک مدرسے کا واقعہ ہے کہ مسجد میں طلبہ امتحان دے رہے تھے، سیاسیات کے پرچے میں گنڑ پت دیوتپا سے جو کسی زمانے میں اتر پردیش کے گورنر تھے، کا نام آیا۔ سائیکلو اسٹائل ہونے کی وجہ سے یہ لفظ کچھ مٹا مٹا سا تھا۔ متعلق مضمون کے استاذ نے اسے ٹھیک کرانے کے لیے بآواز بلند طلبہ کو صحیح لفظ بتایا۔ ایک استاذ جلدی جلدی چل کر آئے اور ماسٹر صاحب سے کہا کہ خدا کے لیے بچوں کو مسجد سے باہر لے جائیے،

ایسے الفاظ اور مسجد میں!

غرض اس طرح کے واقعات بہت عام ہیں۔

ہم جب ہندوستان میں اپنی تاریخ دیکھتے ہیں تو ہمیں ہندی ادب کے سلسلہ میں اس خان، عبدالرحیم خان خاناں، اور ملک میر محمد جائسی نظر آتے ہیں لیکن عجیب بات ہے کہ اس کے بعد یہ تسلسل برقرار نہ رہ سکا۔

مولانا مودودیؒ کی مذکورہ تجویز کا خاطرخواہ اثر نہیں ہوا، حالانکہ یہ بڑی اہم بات تھی۔ ہم الہ آباد سنگم پر دیکھتے ہیں کہ گنگا جمنا کا پانی دور تک الگ الگ بہہ رہا ہے۔ بالکل ایسے ہی یہاں مختلف زبانوں کے لوگ بالخصوص مسلمان اور برادران وطن الگ الگ رہ رہے ہیں حالانکہ سب ایک ہی معاشرے کا حصہ ہیں۔

کاش یہ دیوار ٹوٹے تو اس کے بڑے دوررس مثبت اثرات پڑیں گے۔ اس طرف متوجہ ہونے کی ضرورت ہے۔

● **قاسم سید**، چیف ایڈیٹر روزنامہ خبریں، موبائل نمبر: 09811199061، ای میل: qasimsyed2008@gmail.com

مولانا مودودی کا خطبۂ مدراس غیر منقسم ہندوستان میں منقسم ہندوستان کی تصویر کشی ہے، ان امکانات واندیشہ ہائے دور دراز کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے جو تقسیم ہند کے بعد پیش آسکتے ہیں۔ بلا مبالغہ ان کی بعض پیشین گوئیاں حقیقت کا جامہ پہن کر سامنے بھی آئیں۔ اگر ہندوستانی مسلمانوں کے سواد اعظم نے غیر سنجیدگی اور لاپرواہی کا مظاہرہ نہ کیا ہوتا تو آج کی تصویر کچھ اور ہوتی۔ اسلام کو مکمل نظام حیات کی حیثیت سے پیش کرنے، قادیانیت کے خلاف جدوجہد، وطن پرستی وقوم پرستی پر سخت تنقید، مسلمانوں اور غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت کے ساتھ اقامت دین (پہلے حکومت الٰہیہ کا قیام) کے لیے جماعت کی تشکیل اور بڑے پیمانے پر لٹریچر فراہم کیا۔ کبھی کبھی یقین نہیں ہوتا کہ ایک آدمی نے اتنا سارا کام کیسے کرلیا۔ عام طور پر مفکر عملی انسان نہیں ہوتا اور جو عملی طور پر متحرک ہوتے ہیں وہ فکری اعتبار سے کچھ زیادہ نہیں کر پاتے، مولانا مودودی کی شخصیت اس لحاظ سے اپنے ہم عصروں سے منفرد نظر آتی ہے۔

خطبہ مدراس میں بیان کردہ چوتھا نکتہ پورے خطبہ کا نچوڑ اور اس کی اصل روح ہے، یہ ایجنڈہ قابل عمل بھی تھا اور لازمی بھی، اسے حرز جاں بنا کر زندگی میں اتارنے کی ضرورت پہلے بھی تھی اور آج بھی ہے، اس کی تازگی ختم نہیں ہوئی۔ جہاں تک تحریک اسلامی کا تعلق ہے اس نے شاید یہ وہ نکتہ ہے جس پر صدق دل سے کام کیا اور ہندوستان کی علاقائی زبانوں میں اسلام سے متعلق لٹریچر منتقل کر کے پوری ملت

کی طرف سے فرض کفایہ ادا کر دیا، جیسا کہ مولانا مودودی نے آگاہ کیا کہ علاقائی زبانیں تعلیم کی زبانیں ہوں گی اور ملک کا لٹریچر انہی زبانوں میں شائع ہوگا، اگر مسلمان اپنی قومی عصبیت کی بنا پر صرف اردو تک اپنی تحریر وتقریر محدود رکھیں گے تو ملک کی عام آبادی سے بیگانے ہوکر رہ جائیں گے۔ لیکن مولانا مودودی کے یہ خواب وخیال میں ہی نہیں رہا ہوگا کہ خود مسلمان مادری زبان سے رشتہ توڑ لیں گے اور دو نسلوں کے گزر جانے کے بعد اردو بھی بیگانہ زبان ہوجائے گی اور علاقائی زبانیں صرف مادری زبان ہی نہیں تہذیبی زبان بھی بن جائیں گی۔ مولانا نے علاقائی زبانوں کے استعمال پر شدت کے ساتھ زور دیتے ہوئے کہا کہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ اردو زبان باقی رہے اور فروغ پائے لیکن اسلام کے مستقبل کو اردو کے ساتھ باندھنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ مولانا کو البتہ یہ احساس ضرور تھا کہ آگے چل کر مسلمان بچے درسگاہوں میں تعلیمی زبان اور درسگاہوں کے باہر سرکاری اور ملکی زبان سے اس قدر متأثر ہوں گے کہ اردو سے ان کا تعلق برائے نام رہ جائے گا۔ اور اگر ان زبانوں میں کافی اسلامی لٹریچر نہیں ملا تو وہ بالکل اکثریت کے رنگ میں رنگتے چلے جائیں گے۔ ان کے نزدیک اردو زبان کا تحفظ وفروغ اتنا اہم نہیں تھا جتنا کہ اسلام کی تعلیمات کا فروغ تھا، بھلے ہی وہ کسی زبان میں ہو۔ بھلا ہو مدرسوں کا کہ انہوں نے اردو زبان کو گلے لگا کر رکھا اور اسلامی لٹریچر بھی ضرورت کے مطابق سامنے آتا رہا۔ علاقائی زبانوں کو سیکھنے پر مولانا کا زور اس بات کا مظہر تھا کہ وہ بخوبی سمجھ رہے تھے کہ آنے والی تبدیلی کی آندھیاں اپنے ساتھ بہت کچھ لے جائیں گی۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی موجودہ حالت بتاتی ہے کہ ان کے خدشات درست تھے۔ انہوں نے بجا طور پر کمیونزم کے خطرے سے آگاہ کیا تھا، کیونکہ یہ فیشن کی طرح معاشرہ میں پھیلتا جارہا ہے، گرچہ اب سوویت یونین کے زوال کے بعد یہ طوفان نہ صرف تھم گیا ہے بلکہ اپنے وجود کی بقا کی جنگ لڑ رہا ہے اور قصہ پارینہ بنتا جارہا ہے۔ مولانا مودودی نے ہندوستانی مسلمانوں کی تہذیبی، معاشرتی اور سیاسی حالت کے تعلق سے جن خدشات کا اظہار کیا تھا وہ حرف بہ حرف درست ثابت ہوئے۔ ایسے مسلمانوں کی ایک فوج تیار ہوگئی جو خود کو مسلمان کہنے سے شرماتی ہو اور جدید طبقہ کی رکنیت حاصل کرنے کے لیے کوئی بھی سمجھوتہ کرنے کے لیے ہمہ وقت آمادہ رہتی ہو۔ یہی نہیں ایک دسترخوانی قبیلہ بھی وجود میں آگیا جو صرف اپنے مفاد کے تئیں حساس و بیدار رہتا ہے، جبکہ صراط مستقیم پر چلنے والوں کے لیے داخلی وخارجی مشکلات ہر وقت خوش آمدید کہنے کے لیے بے قرار رہتی ہیں۔ انہوں نے بجا طور پر آگاہ کیا کہ اسلام پر جمنے والوں اور اس کے لیے کام کرنے والوں کو زندگی کا سامان بھی مشکل سے میسر آئے گا اور ہر قدم پر حوصلہ شکن حالات کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ غیرت اسلامی اور عزت نفس کو ہر وقت چرکے لگیں گے، دیکھا جائے تو آہستہ آہستہ مسلم معاشرہ بھی اپنی خوبو چھوڑ کر دوسروں کے چمن کے رنگ وبو کو لالچ وحسرت کی نظر سے دیکھنے لگا، اگر ملک میں مدارس کا جال نہ بچھایا جاتا اور تحریک

اسلامی نے اپنی بساط بھر کوششیں نہ کی ہوتیں تو اسلامی شعائر کا تذکرہ تاریخ کی کتابوں میں ملتا۔ مدارس نے کسمپرسی، بے چارگی اور کم مائیگی کے باوجود قدموں کو متزلزل نہیں ہونے دیا اور تحریک اسلامی نے مصائب و آزمائش کی آندھیوں میں خود کو سنبھالے رکھا، حالانکہ اب اس نے بھی مصلحتوں اور خاموشیوں سے مفاہمت کر لی ہے، کہنہ سالی نے قوی کو شل کر دیا ہے، اس کی وجہ یہ رہی کہ رگوں میں تازہ خون کی آمد کم ہوگئی اور جس طرح کسی مریض کو ضرورت کے مطابق خون چڑھایا جاتا ہے تو یہ نہیں دیکھا جاتا کہ خون کس کا ہے اور کیسا ہے، صرف گروپ کی پابندی کو اولیت دی جاتی ہے، اسی طرح تحریک اسلامی کو ملنے والے خون میں وہ حرارت اور گرمی نہیں تھی کہ دلوں اور مزاجوں کے فرق و اختلاف کو مٹا کر بنیانٌ مرصوص بن جاتے، تنگیٔ نفس کو کچلتے اور غیر ضروری مشاغل ترک کر کے اپنا سب کچھ اس کام کے لیے وقف کر دیتے جو خدا کے فرمان کے مطابق ہے، اس جیسی نصیحتوں کو حرز جاں بنا کر نہیں رکھا گیا جو اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لیے ضروری تھا۔ بہر حال ان خامیوں کو نظرانداز کر دیا جائے جو وقت کے ساتھ گروپوں، تنظیموں، قوموں میں پیدا ہونے لگتی ہیں تو مولانا مودودی نے آخری نکتہ میں جن باتوں پر زور دیا تھا تحریک اسلامی نے ایمانداری سے ان پر چلنے کی کوشش کی اور کم و بیش ہر علاقائی زبان میں ترجمہ کا تاریخی کام کیا جو صدیوں پر بھاری ہے۔ البتہ اگر امت نے بحیثیت مجموعی یہ کار خیر انجام دیا ہوتا اور فرض منصبی پر توجہ دی ہوتی تو ہندوستان کے حالات اور کچھ ہوتے۔ پھر بھی منقسم ہندوستان کی تمام نزاکتوں، کدورتوں، عصبیتوں اور مخالفتوں کے ماحول میں جو کچھ کیا جاسکتا تھا وہ کیا گیا۔

بہر حال خطبہ مدراس میں پیش کردہ چار نکاتی چارٹر کی اساسی روح کو مدنظر رکھتے ہوئے تجزیہ کیا جائے تو کچھ تحفظات کے ساتھ اس کو لائحہ عمل بنایا جاسکتا ہے، یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ ہندوستان کی تصویر بدل جائے گی لیکن جس اسلامی انقلاب کی طرف مولانا مودودی بار بار اشارہ کرتے ہیں اس کے لیے ہندوستان کی سرزمین کتنی سازگار ہے پیشین گوئی کرنا مشکل ہے۔ دراصل اسلامی انقلاب کی کھیتی جس زمین پر ہونی تھی وہ تو سخت بنجر ثابت ہوئی، اگر اس نے عملی نمونہ دکھایا ہوتا اور اسلامی انقلاب کی ہلکی سی جھلک پیش کی ہوتی تو ہندوستان میں آدھا کام ہو جاتا، مگر بسا آرزو کہ خاک شد۔

● **عبدالقوی فلاحی**، اورنگ آباد۔ موبائل نمبر: 09404257355

اس نکتہ کے تحت سید مودودی رحمۃ اللہ علیہ نے امت مسلمہ کے داعیانہ منصب کے حوالہ سے اس بنیادی شرط کی طرف متوجہ فرمایا ہے جو بالعموم افراد امت اور بالخصوص داعیان دین کے لیے شرطِ لازم کی حیثیت رکھتی ہے۔

بھارت میں رہنے بسنے والے مسلمان، یہاں بسنے والی دیگر اقوام و ملل کے لیے شہداء بالقسط

ہونے کی حیثیت سے دعوت وتبلیغ کے ذمہ دار ہیں۔ یہاں کا اکثریتی طبقہ ''دین رحمت'' سے ناواقف ہے، نتیجتاً اس کو مانتا بھی نہیں اور اس کے تیئں غلط فہمیوں کا شکار بھی ہے۔ اس صورت حال میں ان تک دین اسلام کو پہنچانا، اور ان کے سامنے اس دین کی حقیقی تصویر وتصورات کو رکھنا، اس داعی امت کی ذمہ داری ہے جو اس ملک میں ان کروڑوں انسانوں کے درمیان رہتی بستی ہے۔

چونکہ ملک عزیز کا دعوتی منظر نامہ کئی پہلوؤں سے بہت متنوع ہے، اور یہاں بسنے والی اقوام، اپنے افکار ونظریات، تصورات ومعتقدات، اقدار وروایات، تہذیب وثقافت اور معاشرت وغیرہ کے لحاظ سے ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں۔ اسی طرح بود وباش، خورد ونوش، عادات واطوار، رہن سہن اور لباس وغیرہ کے فرق کے ساتھ اس ملک میں علاقوں، اور صوبوں کے لحاظ سے لوگوں کی بول چال اور استعمال کی زبانیں بھی مختلف ہیں۔ اپنی زبانوں سے ان اقوام وملل کی گہری اور جذباتی وابستگی بھی ہے، اور مافی الضمیر کے اظہار سے لے کر تحریر، مراسلت، صحافت اور سرکاری کام کاج، تعلیمی اداروں میں تدریس وغیرہ میں بھی صوبائی اور علاقائی زبانوں کے ساتھ یہ لسانی گروہ مضبوطی سے جڑے ہوئے ہیں۔

سید مودودیؒ نے افراد امت اور بالخصوص دعوت دین کی علمبردار تحریک کے کارکنان کو دعوتی ذمہ داریوں کی ادائیگی کے لیے خاص کر دین حق کی قولی شہادت کے ضمن میں اس امر پر متوجہ فرمایا کہ مدعو اقوام کی رعایت اور کار دعوت کی اثر پذیری وافادیت کو بڑھانے کے لیے داعی اور مدعو کے درمیان سے لسانی حجابات (Liguistic bareers) کو ختم کریں اور مدعو اقوام کی زبانوں میں مہارت اپنے اندر پیدا کریں۔

مدعو اقوام کی زبانوں کو سیکھنے اور ان کے سامنے ان کی اپنی زبان میں اسلام کے پیغام کو پیش کرنے سے فوائد اور نتائج کا دائرہ بہت وسیع ہوسکتا ہے۔

اول تو یہ کہ اس سے داعی ملت کا یہ موقف واضح ہوتا ہے کہ دیگر لوگوں کے لیے تو زبانیں باہمی تفاخر، تعصب وتباعد، تباغض وتناجش کا ذریعہ ہوسکتی ہیں، لیکن امت مسلمہ کے افراد کے نزدیک کسی بھی زبان کی حیثیت رابطہ کے ذریعہ (Means of communication) کی ہوتی ہے، اور اس کے افراد جس عدل وقسط کے پیغام کے حامل اور داعی ہیں، اس پیغام کی موثر تبلیغ ودعوت کے لیے زبانوں کی اجنبیت ان کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی بلکہ وہ ہر زبان کو سیکھتے ہیں، جس زبان کے بولنے، لکھنے پڑھنے اور سمجھنے والوں کے درمیان رہتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ زبان کے اس بُعد کو ختم کرنے کی وجہ سے مدعو اقوام سے داعی کی قربت بہت بڑھ جاتی ہے اور دیگر فاصلوں کی خلیجوں کو دور کرنے میں اس کا کردار بہت اہم وکارآمد ہوسکتا ہے۔

تیسرے یہ کہ مدعو کی زبان میں اس سے کلام، تقریب فہم کے امکانات کو بہت زیادہ بڑھا دیتا ہے،

مدعو کی اصطلاحات، لفظیات، تعبیرات و استعارات کا استعمال، تفہیم کو مؤثر اور نتیجہ خیز بنانے میں از حد معاون ہو سکتا ہے۔

مدعو کے سلسلہ کی اس نزاکت کی رعایت اللہ تعالیٰ نے بھی فرمائی ہے۔ کسی بھی دعوت کی معنویت و افادیت اس میں مضمر ہے کہ وہ مدعو کے لیے قابل فہم ہو، کوئی ایسی زبان جو مدعو جانتا تو ہو لیکن اس کے لیے اجنبی ہو یا اس کی اپنی زبان (جسے اب مادری زبان کہا جاتا ہے) نہ ہو، اجنبیت کے پردے کی وجہ سے مستوائے فہم (Understanding level) کے لحاظ سے، مادری زبان کا متبادل نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ ہدایت انسانی کے خدائی اہتمام میں اس کا خاص لحاظ رکھا گیا۔

وما أرسلنا من رسول الا بلسان قومه۔

اسی خدائی اہتمام کا مظہر ہے کہ اللہ نے حضرات انبیاء علیہم السلام کو جن علاقوں اور اقوام کے درمیان بھیجا، انہیں اس کی مناسبت سے ان افراد کی مقامی زبان میں خطاب کی مہارت بھی عطا فرمائی۔

اس سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ جہاں مدعو کا حق یہ ہے کہ اس کو دعوت کا مواد اس کی اپنی زبان میں سمجھایا جائے وہیں خدائی اہتمام سے یہ بھی مبرہن ہوتا ہے کہ یہ کسی کے حق میں اتمام حجت کے لیے بھی ضروری ہے، اور یہ لأن لا يكون للناس على الله حجة بعد الرسل کے دائرے میں بھی آتا ہے۔

ان پہلوؤں کے پیش نظر سید مودودیؒ کی یہ تجویز کہ داعی امت کے افراد ملک عزیز کے عوام کی رعایت کرتے ہوئے یہاں موجود علاقائی اور صوبائی زبانوں میں مہارت پیدا کریں مومنانہ فراست کی آئینہ دار ہے۔ ایک ایسے وقت میں جب مسلم امت کئی طرح کی سخت عملی آزمائشوں اور فکر و نظر کی بے اعتدالیوں کا شکار ہو کر قومی تعصب و تنگ نظری کی وادی میں بھٹک رہی تھی، سیاسی و مذہبی فکری بحران کا شکار تھی، اور اپنے آپ کو دیگر اقوام پہ قیاس کر کے ایک قوم تصور کر کے قومیت و قوم پرستی کے حصار میں محصور ہو چلی تھی، جس سے اس کی مشنری حیثیت اور فکر و عمل بھی بری طرح متأثر ہو چلے تھے۔ نتیجتاً کار دعوت اور اس کا کوئی نقشہ و کینوس اس کے سامنے سرے سے موجود ہی نہیں تھا، یا تھا تو موہوم سا تھا۔ ایسی دگرگوں فکری و عملی کیفیات میں سید مودودیؒ کی دور رس نگاہیں، اور مومنانہ بصیرت جو کچھ دیکھ رہی تھی اور جو تداوی کی تدابیر سید مودودیؒ تجویز فرما رہے تھے، ان کی معنویت کل بھی بہت تھی، آج بہت زیادہ ہو چکی ہے اور آئندہ بھی اس میں افزونی ہی کے آثار صاف نظر آ رہے ہیں۔

سید مودودیؒ کی یہ آواز صدا بہ صحرا رہی، اور مسلم امت لسانی تعصّبات میں گرفتار رہی، اردو زبان جس کی اپنی لاکھ اہمیت کے تسلیم شدہ ہونے کے باوجود بدلتے ہوئے حالات میں ملک کے عوام تک ترسیل افکار و تفہیم نظریات کا ذریعہ نہیں ہو سکتی تھی اور نہ ہو سکی۔ اور خود سید مودودیؒ کے اندیشے کے مطابق، ملت کی ایک ''نسل'' کے لیے اردو اجنبی سی ہو گئی، اور آج صورتحال بالکل ہی بدلی ہوئی ہے۔ وہ

سارا تعصب جو قومی بنیاد پر قوموں کے درمیان بعد اور خلیجیں پیدا کرنے کا موجب ہوتا ہے، اس نے لسانی تعصّبات کو بھی خوب فروغ دیا ہے، اور اردو کو مسلمانوں کی زبان ہونے کی حیثیت دے کر اس کے گلے بھی تعصّبات کے سارے طوق ڈال دیے گئے ہیں۔

تحدیث نعمت کے طور پر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ چاہے پوری ملت اور اس کے اہل علم نے سید مودودیؒ کی اس تجویز کو وہ مقام نہ دیا ہو جو کہ اس کا حقیقی مقام تھا، لیکن تحریک اسلامی نے امت کی طرف سے اس فرض کی ادائیگی کی اپنی سی کوشش کی ہے۔ سید مودودیؒ کی تجویز کے مطابق مختلف علاقائی اور صوبائی زبانوں کے ماہر داعیان دین کی تیاری بھی تحریک اسلامی نے کی، اسی طرح ان زبانوں میں قرآن وحدیث، سیرت وتاریخ اور اسلامی لٹریچر کی تیاری کا عظیم کام، اہل ملک اور ملت اسلامیہ کے حق میں تحریک اسلامی کا بڑا Contribution ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ آرائی نہ ہوگی کہ اس ملک کی تاریخ میں مسلم امت کے اہل اقتدار اپنے دورِ اقتدار وغلبہ میں جو کام نہیں کر سکے، تحریک اسلامی نے اپنے محدود وسائل کے ساتھ اس عظیم کام کو انجام دیا ہے۔

آج کی ضرورت ہے کہ سید مودودیؒ کی اس تجویز کو وسعت دے کر تحریک اسلامی اور اس سے وابستہ افراد کو اس امر پر اپنی توجہات مرکوز کرنی چاہئیں کہ ملک کا موجودہ سیاسی، ثقافتی، تہذیبی وتمدنی منظر نامہ بہت کچھ بدل چکا ہے۔ اس کی رعایت کرتے ہوئے یہاں کی مدعو اقوام کی زبانوں میں ان سے خطاب اور ان کی زبانوں میں لٹریچر تیار کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ

(الف) مختلف زبانوں کے میڈیا ہاؤسز میں ہمارے وابستگان نفوذ حاصل کریں، اور جس لسانی طلاقت کے ساتھ اسلام اور اہل اسلام کے خلاف میڈیا کے افراد پروپیگنڈہ کرتے ہیں ان کا جواب اسی لسانی مہارت کے ساتھ اسی ذریعہ کو اختیار کر کے دیا جائے۔ اس پہلو سے کہیں نہ کہیں امت کی کم مائیگی کا احساس ہوتا ہے۔

(ب) تحریک اسلامی کا مختلف زبانوں کا تیار کردہ لٹریچر بالعموم ترجمہ کردہ ہے۔ وہ کتابیں جو ایک مخصوص پس منظر کے ساتھ لکھی گئی تھیں اگر وہ آج کے بدلے ہوئے حالات کے ساتھ مطابقت نہ رکھتی ہوں تو ان کی معنویت وافادیت کے کم ہوجانے کے امکانات ہیں۔ اس لیے اب پرانی کتابوں کے ترجمہ کے ساتھ (اگر وہ بہت ضروری ہو) نئے لٹریچر کی آج کے تقاضوں کے مطابق تیاری کی منصوبہ بندی کی جائے۔ اس کے لیے ماہر افراد کا انتخاب ضروری ہے اور اس خاص مقصد کے ساتھ ان کی تربیت باضابطہ ایک پروجیکٹ بنا کر کی جانی چاہیے۔ تحریک اسلامی کی طلبہ تنظیم بھی اس پر خصوصی توجہ مرکوز کر کے، نسل نو کے کچھ منتخب افراد کو اس خاص مقصد کے لیے تیار کرنے کے منصوبہ پر کام آگے بڑھا سکتی ہے۔

(ج) دینی مدارس وجامعات، اپنے نصاب تعلیم میں اس بات کا خاص اہتمام کریں کہ وہ جن

علاقوں میں ہوں ان علاقوں کی زبانوں کی تدریس، اورلسانی مہارت اپنے طلبہ میں پیدا کرنے کی مؤثر منصوبہ بندی کریں۔ دینی مدارس سے وابستہ طلبہ ان معنوں میں دیگر عصری اداروں کے طلبہ سے ممتاز ہوتے ہیں کہ وہ بیک وقت کئی علوم کی تحصیل میں مصروف ہوتے ہیں۔ ان کو رجوع وارتکاز واخلاص دوسروں کے مقابلے میں زیادہ ہوتا ہے (بالعموم) اور مقصد تعلیم وتعلم کی عظمت وپاکیزگی غیر معمولی الٰہی نصرت کی ضامن ہوسکتی ہے۔

● **ڈاکٹر محی الدین غازی،** ڈین فیکلٹی آف قرآن الجامعہ الاسلامیہ شانتاپرم کیرلا موبائل نمبر:09746445135

ہندوستان کی موجودہ صورت حال میں اردو زبان کے بجائے ہندی زبان اور دیگر ریاستی زبانوں کو اپنی زبان بنالینا عام مسلمانوں کے لیے کہاں تک مفید اور ضروری ہوسکتا ہے، یہ میری گفتگو کا موضوع نہیں ہے، اور نہ مولانا مودودی نے خطبہ مدراس میں اس کو موضوع بنایا ہے۔ یوں بھی اب صورت حال بدل چکی ہے، اور مسلمانوں کی نئی نسل اردو سے ہندی اور مقامی زبانوں کی طرف تیزی سے نقل لسانی کررہی ہے۔

مسئلے کا زیر بحث پہلو یہ ہے کہ ملک کی موجودہ صورت حال میں مسلمانوں کے علماء اور مصلحین کی زبان کیا ہو، اور یہاں تیار ہونے والے دینی لٹریچر کی زبان کیا ہو؟

ہندوستان کی بعض ریاستوں میں زبان کا کوئی مسئلہ سرے سے نہیں ہے، جیسے ریاست کیرلا کے مسلمانوں کی زبان وہی ہے جو ان کے ہمسایہ غیر مسلموں کی ہے، وہاں علماء دین کی زبان بھی وہی ہے جو مسلم عوام کی ہے۔ جس زبان میں اخبارات پڑھے جاتے ہیں، اسی زبان میں دینی لٹریچر بھی لکھا اور پڑھا جاتا ہے، اور اسی زبان میں علماء ومصلحین کے خطابات بھی ہوتے ہیں۔

لیکن ملک کی بیشتر بڑی ریاستوں میں صورت حال بڑی عجیب ہے، وہاں بہت سارے مسلمانوں کی زبان اردو ہے اور غیر مسلموں کی زبان ہندی یا کوئی مقامی زبان ہے، یہ سماجی لحاظ سے بھی نقصان دہ ہے اور دینی ودعوتی پہلو سے بھی۔ لسانی اجنبیت سے سماجی فاصلے بھی بڑھتے ہیں، ایک ہی مقام پر بسنے والوں کے درمیان لسانی دوئی سماجی دوریوں کو بڑھاتی ہے، جبکہ دعوت دین کے لیے داعی اور مدعو میں زبان کا اشتراک بہت ضروری ہے، جس طرح سماجی دوریاں دعوتی کارکردگی کے لئے مناسب نہیں ہیں۔

ہندی ریاستوں میں بول چال کی زبان میں کسی حد تک مشابہت حاصل ہوجاتی ہے، بڑا مسئلہ رسم الخط کے اختلاف کا ہوتا ہے، لیکن بعض غیر ہندی ریاستوں میں جہاں بہت سارے مسلمانوں کی زبان اردو ہے، وہاں تو ہر لحاظ سے دو الگ الگ زبانیں ہوتی ہیں، جن کے بیچ کوئی ربط نہیں ہوتا ہے۔

ملک اور ریاست کی زبان سے بیزاری اور اردو زبان کو اپنی زبان سمجھنے سے بڑی پیچیدگیاں خود مسلمانوں کے اندر پیدا ہو رہی ہیں، موجودہ صورت حال یہ ہے کہ عام مسلمانوں اور خاص طور سے نئی نسل کے لکھنے پڑھنے کی زبان اردو نہیں رہی، جبکہ ملک میں دستیاب دینی لٹریچر اردو میں ہے۔ علمائے دین کی تقریر وتحریر کی زبان عالمانہ سطح کی عربی آمیز اردو ہے، جبکہ نئی نسل کے لیے عام اردو بھی قابل فہم نہیں رہی۔

واقعی صورت حال یہ ہے کہ کچھ خاص مسلمانوں کی اور علماء کی زبان اردو ہے، عام مسلمانوں کی لکھنے پڑھنے کی زبان اردو نہیں ہے، غیر مسلموں کی زبان بھی اردو نہیں ہے، جبکہ دینی لٹریچر کی زبان اردو ہے۔ یہ تضاد سے بھرپور صورت حال بہت پیچیدہ اور تشویش ناک ہے، اس طرح خود مسلمانوں سے ہمارا اصلاح وتربیت اور ذہن سازی کا تعلق قائم نہیں ہو پا رہا ہے، اور غیر مسلموں سے دعوت کا رشتہ استوار کرنا بھی کما حقہ ممکن نہیں ہو پاتا ہے۔

معلوم ہونا چاہیے کہ اردو زبان سے مسلمانوں کی نئی نسل کی دوری دن بدن بڑھتی ہی جا رہی ہے، اور ایسی کوئی صورت نظر نہیں آتی کہ اردو عام مسلمانوں کے لکھنے پڑھنے کی زبان کبھی بھی بن سکے گی، اور اگر بن بھی جائے، تو دوسروں کی زبان نہیں بن سکے گی، ایسے میں مسلمانوں کے حق میں بہتر یہی ہے کہ ان کے مصلحین جتنی جلدی ہو سکے مسلمانوں کو اس کے لیے تیار کریں کہ ملک اور ریاست کے لسانی دھارے میں شمولیت کے باوجود ان کا دینی اور تہذیبی تشخص محفوظ رہے، اس لیے نہ صرف یہ کہ دینی لٹریچر کو ہندی اور مقامی زبانوں میں منتقل کیا جائے، بلکہ دینی تعلیم گاہوں کی زبان بھی ملک اور ریاست کی اکثریتی زبان ہو جانا چاہیے، تاکہ آئندہ تیار ہونے والے علماء ومفکرین اور اہل زبان وقلم ملک میں لکھی پڑھی جانے والی زبانوں میں مسلم عوام کو بھی اور غیر مسلم عوام کو بھی بخوبی مخاطب کر سکیں، اور ان کی بھرپور علمی وفکری قیادت کر سکیں۔

یاد رہنا چاہیے کہ اردو زبان سے مسلمانوں کا کوئی قدیم دینی وتہذیبی رشتہ نہیں رہا ہے، سر سید اور شبلی سے پہلے تو یہ محض شعر وشاعری کی زبان تھی، ہاں چونکہ اس کا رسم الخط وہی ہے جو فارسی اور عربی کا ہے اس لیے رسم الخط سے مسلمانوں کا تعلق قدیم قرار دیا جا سکتا ہے، لیکن اب تو نئی نسل بڑی حد تک دوسری زبانوں کے رسم الخط سے زیادہ مانوس ہو چلی ہے۔ مان لینا چاہیے کہ نقل لسانی تقریباً ہو چکی ہے، صرف مسلمانوں کے اہل علم کا ان ملکی اور ریاستی زبانوں سے واقف اور ماہر ہونا باقی رہ گیا ہے، وہ ہو جائے تو زبان کی سطح پر ایک پلیٹ فارم پر سب جمع ہو سکتے ہیں، جس کے بعد دینی اور تہذیبی تعارف کی راہیں آسان ہو جائیں گی۔

یاد رہے کہ موجودہ صورت حال اس پہلو سے بھی خطرناک ہے کہ رائج الوقت زبان اور رائج الوقت رسم الخط کی وجہ سے بے دین مسلم وغیر مسلم مصنفین مسلمانوں کی نئی نسل سے اسلام پسند علماء ومصنفین کے

مقابلے میں زیادہ قریب آگئے ہیں، اور مسلمانوں کی نسل نو کی ذہن سازی میں ان کا کردار زیادہ مؤثر ہوگیا ہے، کیونکہ ہم تو اردو میں خود لکھ کر خود پڑھنے کی حد تک محدود ہوگئے ہیں۔ محدود ہونے کے پیچھے صرف یہ سبب نہیں ہے کہ ہماری آواز میں دور تک جانے کی طاقت نہیں ہے، بڑا سبب یہ ہے کہ ہم نے جس زبان کو اپنی بات پہنچانے کے لیے اختیار کیا ہے، وہ دور تک آواز کو پہنچانے کی استطاعت ہی نہیں رکھتی ہے۔

میرا ذاتی تجربہ ہے کہ سوشل میڈیا پر شائع ہونے والے میرے مضامین میرے بہت سے رشتے دار اور متعلقین محض اس وجہ سے نہیں پڑھ پاتے کہ میں اردو میں لکھتا ہوں اور ان کی لکھنے پڑھنے کی زبان ہندی ہے۔

اردو زبان سے ہمارا جذباتی تعلق ہے، اردو زبان سے یہ جذباتی تعلق قومی کشمکش کے سائے میں پلا بڑھا ہے، اس کو وہیں سے غذا ملی ہے، لیکن صورت حال کے تقاضوں سے صرف نظر کرکے اب بھی اس پر اصرار کرتے رہنا ہم کو خود مسلمانوں کے درمیان اجنبی اور بے نفع بنادے گا۔ اردو زبان کو ہندوستانی سیاست اور قومی کشمکش نے سخت نقصان پہونچایا ہے، لیکن اردو زبان پر اصرار اور دیگر زبانوں سے بیزاری خود مسلمانوں کے لئے نقصان دہ ہوسکتی ہے۔

عوام کی نقل لسانی تو صورت حال کے جبر کے تحت از خود ہو رہی ہے، لیکن علماء اور مصلحین کی نقل لسانی ایک اعلی مقصد کے تحت ہونا چاہئے، یہ آسان کام نہیں ہے، اس کے لیے فیصلہ اور قوت ارادی مطلوب ہے، دینی مدارس اور مکاتب کی زبان کو بدلنا ہوگا تاکہ فارغ ہونے والے علماء ہندی زبان کے ماہر ہوں جس طرح سے ابھی وہ اردو زبان کے ماہر ہوتے ہیں، یہ کام منصوبہ بندی کے تحت بتدریج کرنے کا ہے، یہ مشکل کام ہے لیکن ناممکن نہیں ہے، اگر اس کام کی اہمیت کا احساس ہوجائے اور یہ یقین ہوجائے کہ اس میں کوئی نقصان نہیں ہے۔ ریاست کیرلا کے مدارس میں ملیالم میں فقہ حدیث اور تفسیر کو پڑھایا جاسکتا ہے، تو یوپی اور بہار میں ہندی زبان دینی مدارس کی زبان کیوں نہیں ہوسکتی ہے۔ اور اگر ملک کی ہندی ریاستوں کے دینی مدارس کی زبان ہندی ہوجائے، تو جلد ہی بہت بڑی تعداد میں ایسے علماء و مصلحین تیار ہوجائیں گے، جو مسلمانوں میں اصلاح وتربیت کا کام اور غیر مسلموں میں دعوت کا کام مؤثر طریقے سے انجام دے سکیں۔ اسی طرح کی بڑی تبدیلی غیر ہندی ریاستوں میں بھی آسکتی ہے اگر وہاں ریاستی زبانوں میں دینی تعلیم کا سلسلہ شروع کیا جائے۔

ہندوستان کی اسلامی تحریک نے دینی لٹریچر کو ہندی زبان اور دیگر ریاستی زبانوں میں منتقل کرنے کا کچھ کام کیا ہے جو قابل قدر ہے، لیکن اس کی حیثیت اب تک ثانوی درجے کے کام کی رہی ہے جو کچھ لوگوں کے ہاتھ انجام پایا ہے، تحریک کے کچھ خاص افراد ان زبانوں کے مقرر اور مصنف ومترجم ہیں، جنہیں انگلیوں پر گنا جاسکتا ہے۔ بحیثیت مجموعی پوری تحریک ان زبانوں سے ایک فاصلے پر کھڑی نظر آتی ہے۔

میرا خیال ہے کہ ہندوستان کی اسلامی تحریک کو ہندی اور ریاستی زبانوں میں دینی لٹریچر منتقل کرنے سے اور آگے بڑھ کر خود اپنے آپ کو ان زبانوں میں منتقل کرنے کا منصوبہ بنانا چاہیے، اور وژن طے کرنا چاہیے کہ اتنے سالوں میں تحریک اسلامی کی اپنی زبان مکمل طور سے اردو کے بجائے ہندی ریاستوں میں ہندی اور دیگر ریاستوں میں وہاں کی زبان ہو جائے گی۔

● **سید مطیع الرحمن حنیف فلاحی**، قطر، ای میل:
syed_mutiurrahman_haneef@yahoo.com

مولانا مودودی نے خطبہ مدراس میں مسلمانوں کے سامنے جو چوتھا نکتہ پیش کیا تھا، وہ یہ تھا کہ وہ ہندوستان کی مقامی زبانوں کو سیکھیں اور ان میں تقریر و تحریر کی صلاحیت پیدا کریں، تا کہ وہ جس تحریک کی دعوت کو لے کر اٹھے ہیں اسے زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچا سکیں۔

اس میں کوئی دو رائے نہیں ہے کہ اللہ تعالی نے ہمیں دنیا میں جس اہم مقصد سے بھیجا ہے، اسے جاننے کے لیے ہمارے لیے یہ بہت ضروری ہے کہ ہم یہ جانیں کہ برائیوں سے کیسے بچا جائے اور اچھائیوں کو کیسے اختیار کیا جائے۔ چنانچہ اس کے لیے ہمیں یہ پتہ لگانا بہت ضروری ہے کہ اچھا کیا ہے اور برا کیا ہے۔ اسی کو ہدایت کہتے ہیں اور یہ صرف ہمارا بنانے والا ہی ہمیں بتا سکتا ہے۔ اسی ہدایت کو پہنچانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ہر زمانے میں انبیاء علیہم السلام کو مبعوث فرمایا۔ یہاں تک کہ پہلے ہی انسان کو نبی بنایا اور ایک دن کے لیے بھی انسانیت کو اندھیرے میں نہ چھوڑا۔ اللہ تعالیٰ نے انبیاء پر پیغامِ ہدایت نازل کرنے کے لیے انسان کی ضرورت کا لحاظ فرمایا۔ پیغام کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے چونکہ انسان کو زبان کی ضرورت ہوتی ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیغام پہنچانے کے لیے زبان اختیار فرمائی۔ اِس طرح انسان کو زبان کے ذریعے اچھے اور برے کا جاننا آسان ہو گیا۔ اور زبان ہی کے ذریعہ سے کامیابی کی کنجی اس کے ہاتھ لگ گئی، جس کے ذریعہ وہ آخرت میں کامیابی حاصل کر سکے۔ لہٰذا ہم سمجھ سکتے ہیں کہ زندگی کو صحیح راہ پر لگانے کے لیے یہ کس قدر ضروری ہے کہ ہم جس زبان سے مانوس ہیں اس زبان میں وہ خدائی ہدایت ہمیں مل جائے، جس کے ذریعہ سے ہم آخرت میں کامیاب و کامران ہو سکیں۔

ہندوستان کی علاقائی زبانوں کے تعلق سے ابتداء سے عام مسلمانوں کا رویہ یہ رہا ہے کہ انہوں نے ان زبانوں پر بالکل بھی کوئی توجہ نہیں دی۔ دراصل، ان کا یہ طرز عمل یہ ظاہر کرتا ہے کہ انہیں اس سے کوئی سروکار نہیں ہے کہ جو خدائی ہدایت ان تک پہنچی ہے وہ دیگر لوگوں تک پہنچتی ہے یا نہیں، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ تو خدا کا کام ہے۔ ہم تو بس اس پر خوش ہیں کہ ہمارے ہاتھ کامیابی کی سیڑھی لگ چکی ہے۔

یہ بات بالکل حق بجانب ہے کہ مسلمان اردو زبان کو دیگر زبانوں کے مقابلہ میں اس لیے زیادہ

اہمیت دیتے ہیں کہ یہ وہ زبان ہے، جس میں اسلامی لٹریچر وافر مقدار میں پایا جاتا ہے۔ اردو زبان دنیا کی زبانوں کی تاریخ کا ایک معجزہ ہے۔ زبانوں کی تاریخ بتاتی ہے کہ دوسوڈھائی سوسال زبانوں کی زندگی میں کچھ بھی نہیں ہوتے۔ اتنے عرصے میں زبانیں ٹھیک سے گھٹنوں چلنا بھی نہیں سیکھتیں۔ لیکن اردو زبان مختصر سے عرصے میں پورے برصغیر کی زبان بن کر کھڑی ہوگئی۔ لیکن اردو کا صرف یہی ایک کارنامہ نہیں ہے۔ اردو نے دوسوسال میں دنیا کی کسی بھی دوسری زبان سے کہیں زیادہ مذہبی ادب پیدا کر کے دکھایا ہے۔ اردو کا خالص ادبی سرمایہ بالخصوص شعری سرمایہ بھی غیر معمولی ہے۔ اردو نے عملاً ثابت کیا ہے کہ اس کے ذریعے کم وبیش ہر علم کی تعلیم دی جاسکتی ہے۔ اردو کے لسانی تنوع کا یہ عالم ہے کہ اس نے ایک جانب تفسیر اور سیرت کا بڑا سرمایہ پیدا کر کے دکھایا ہے، وہیں اس نے اسلامی تہذیب اور ثقافت کی بقا کی بھی ضمانت دی ہے۔ تقسیم ہند کے موقع پر ہندوستان و پاکستان کی تقسیم میں مذہب کے بعد جس چیز نے سب سے اہم کردار ادا کیا وہ یہی اردو زبان تھی۔ اردو زبان دوقومی نظریہ کا ایک بڑا اور بنیادی حوالہ تھی۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہونا چاہیے کہ ہندوستان کی مختلف ریاستوں میں پائی جانے والی علاقائی زبانوں کو کوئی اہمیت نہ دی جائے۔ یہ بالکل سمجھ میں آنے والی بات ہے کہ اگر مختلف علاقائی زبانوں میں اسلامی لٹریچر موجود نہ ہوتو آخر لوگ کیسے اسلام سے واقف ہوں گے۔ چنانچہ مولانا مودودی کا یہ مشورہ بالکل بجا تھا کہ مسلمان ہندوستان کی مختلف علاقائی زبانوں کو سیکھیں اور ان میں تقریر وتحریر کی صلاحیت پیدا کریں۔

اعداد وشمار بتاتے ہیں کہ 130 کروڑ کی آبادی والے ملک ہندوستان کی 36 ریاستوں میں بے شمار علاقائی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ جیسے جیسے ہم یہاں ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کرتے جاتے ہیں ہر علاقے کے طرز زندگی اور رسم ورواج کے ساتھ ساتھ زبان بھی مختلف ہوتی جاتی ہے۔ ان بولی جانے والی زبانوں میں سے 29 زبانیں ایسی ہیں، جنہیں ایک لاکھ سے زیادہ افراد بولتے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان ہندی ہے جس کے بولنے والے افراد کا تناسب ہندوستان کی آبادی کا 41 رفیصد ہے۔ جبکہ اردو زبان کو ان تمام زبانوں میں چھٹا مقام حاصل ہے، جس کے بولنے والوں کا تناسب ہندوستان کی آبادی کا 5 رفیصد ہے۔

جہاں تک ہندوستان کے آئین کا تعلق ہے، اس نے ہندی اور اردو کے بشمول تقریباً 22 زبانوں کو شیڈول زبانوں کا درجہ دے رکھا ہے اور مزید 33 زبانوں کا معاملہ زیر غور ہے۔ جیسا کہ ایک مرتبہ جب کوئی زبان اس فہرست میں شامل ہو جاتی ہے تو اس کا مقام فوری طور پر تبدیل ہو جاتا ہے اور اسے جدید بھارتی زبان یا شیڈول زبان کہہ کر پکارا جانے لگتا ہے۔ بھارتی آئین کا آٹھواں شیڈول زبان کی پالیسی کے حوالے سے سب سے اہم دستاویز ہے۔ جو ہزاروں لکھی اور نہ لکھی جانے والی زبانوں کو دو بڑے حصوں، شیڈول اور غیر شیڈول زبانوں میں تقسیم کرتا ہے۔ شیڈول زبانوں کو غیر شیڈول زبانوں پر

فوقیت دی جاتی ہے اور زبان کی نشوونما سے متعلق کسی بھی سرگرمی کے لیے انہیں پہلے زیرغور لایا جاتا ہے اور زبان کے حوالے سے تمام تر سہولیات خاص طور پر ٹیکنالوجی کو زبان میں ضم کرنے کے حوالے سے حکومت کے حوصلہ افزا اقدامات بھی فی الحال انہی زبانوں تک محدود ہیں۔

ان اعداد وشمار کی روشنی میں ہم بآسانی یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مولانا کی بات کس قدر اہمیت کی حامل تھی، انہوں نے مسلمانوں کو یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ مختلف ریاستوں کی علاقائی زبانوں کو سیکھیں اور ان زبانوں میں اسلام کا لٹریچر منتقل کریں۔ اگر بفرض محال ایسا نہ ہوا ہوتا اور مسلمانوں نے محض اردو زبان ہی تک اپنے آپ کو محدود کرلیا ہوتا تو علاقائی زبانوں میں اسلام کے بنیادی لٹریچر کی فراہمی کا کام پایہ تکمیل کو نہ پہنچتا اور آج آزادی کے 69 سال بعد بھی ہندوستان کا ایک بڑا طبقہ اسلام کی دعوت سے محروم ہی رہتا۔ جبکہ مولانا مودودی کے تجویز کردہ نکتے کی روشنی میں جماعت اسلامی نے اسلامی لٹریچر کو ہندوستان کی مختلف علاقائی زبانوں میں منتقل کرنے کا محاذ سنبھالا اور اس کے نتیجے میں آج ہندوستان کی کم وبیش تمام ہی ریاستوں کی علاقائی زبانوں میں اسلامی لٹریچر موجود ہے، جس سے ان زبانوں کے جاننے والے افراد استفادہ کرتے ہیں۔

علاقائی زبانوں کی اہمیت جہاں اس وجہ سے بھی ہے کہ لوگ اسلامی تعلیمات سے آگاہ ہوسکیں، وہیں اس بات میں بھی کوئی شک نہیں کہ ملک میں بسنے والے مختلف مذاہب کے ماننے والوں اور مختلف ریاستوں میں آباد لوگوں کو متحد رکھنے کے لیے زبان ایک نہایت اہم اور مفید ذریعہ ہوتی ہے۔ لوگوں کو اپنی اس زبان سے قدرتی محبت ہوتی ہے، جسے وہ بچپن سے بول رہے ہوتے ہیں۔ چنانچہ جب ہم ان زبانوں میں اسلام کی تعلیمات ان تک پہنچاتے ہیں تو وہ ان کے دلوں میں گہرے نقوش چھوڑتی ہیں۔

آزادی کے بعد سے اب تک کی تاریخ گواہ ہے کہ علاقائی زبانوں میں بنیادی اسلامی لٹریچر کے پائے جانے کی بدولت غیر مسلموں میں دعوت کا کام بہت ہی مؤثر رہا ہے اور عام مسلمانوں میں بھی اس کی بدولت اسلام سے واقفیت عام ہوئی ہیں اور وہ بھی دیگر مسلمانوں کے پہلو بہ پہلو اسلام کی اشاعت کا کام کرنے میں جٹ گئے ہیں۔

● **اشتیاق عالم فلاحی**۔ دوحہ، قطر، ای میل: i_falahi@gmail.com

ایک داعی گروہ کو مدعو قوم سے قریب ہونے اور ان تک مؤثر طریقے سے اپنا پیغام پہنچانے کے لیے مختلف وسائل کا استعمال کرنا پڑتا ہے۔ ان وسائل میں سے ایک زبان بھی ہے۔ ایک زبان سے وابستہ افراد ایک دوسرے کو جتنے بہتر انداز میں سمجھتے ہیں اور پیغام کی ترسیل کا کام جتنے اچھے انداز میں ہوسکتا ہے دیگر زبان کے افراد اتنے بہتر انداز میں وہ کام نہیں کرسکتے۔ اللہ تعالیٰ نے جتنے انبیاء بھیجے وہ

سب اپنی مدعوقوم کے ہم زبان تھے۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:وَمَا أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهِ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ فَيُضِلُّ اللّهُ مَن يَشَاءُ وَيَهْدِي مَن يَشَاءُ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ(سورہ ابراہیم:۴)

(ہم نے اپنا پیغام دینے کے لیے جب کبھی کوئی رسول بھیجا ہے، اُس نے اپنی قوم ہی کی زبان میں پیغام دیا ہے تاکہ وہ انہیں اچھی طرح کھول کر بات سمجھائے پھر اللہ جسے چاہتا ہے بھٹکا دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت بخشتا ہے، وہ بالا دست اور حکیم ہے۔)

زبانیں اللہ کی نعمت اور اس کی نشانی ہیں:وَمِنْ آيَاتِهِ خَلْقُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافُ أَلْسِنَتِكُمْ وَأَلْوَانِكُمْ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّلْعَالِمِينَ۔(الروم:۲۲)

(اور اس کی نشانیوں میں سے آسمانوں اور زمین کی پیدائش، اور تمہاری زبانوں اور تمہارے رنگوں کا اختلاف ہے یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں دانشمند لوگوں کے لیے۔)

دنیا میں لاتعداد زبانیں پائی جاتی ہیں۔ ہر زبان کا اپنا رنگ اور اس کا اپنا لطف ہے۔ ہندوستان اپنی جغرافیائی وسعت کے ساتھ ساتھ جہاں رنگا رنگ ثقافت کا مرکز، مختلف النوع افکار و خیالات کا گہوارہ اور متعدد تہذیبوں کا محافظ رہا ہے وہیں یہ بہت سی زبانوں کا مرکز رہا ہے۔ یہاں قدم قدم پر زبانیں بدلتی ہیں۔۲۲رزبانیں دفتری طور پر تسلیم شدہ زبانیں ہیں۔ زبانوں سے مالا مال اس ملک میں بعض وجوہ سے مسلمانوں کی زبان اردو بن گئی۔ اردو کے آغاز و ارتقاء سے ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کا کس حد تک تعلق ہے یہ ایک الگ موضوع ہے لیکن عملاً مسلمان اردو زبان کے حصار میں قید ہو کر رہ گئے۔ ریاست حیدرآباد کی دفتری زبان اردو تھی۔ جامعہ عثمانیہ میں اردو کو ذریعۂ تعلیم کے طور پر اختیار کیا گیا لیکن سقوطِ حیدرآباد کے بعد اردو کا ریاستی کردار حاشیہ میں جانے کے باوجود بھی یہاں کے مسلمانوں نے تیلگو زبان سے ایک فاصلہ بنا کر رکھا۔ مقامی زبان سے واقفیت اور اس میں مہارت دھیڑوں کا وصف قرار پایا۔

مقامی زبان سے دوری کا یہ نتیجہ ہوا کہ مسلمانوں اور ہندوستان کی عام آبادی کے درمیان اجنبیت کی ایک دیوار حائل ہو گئی، غلط فہمیوں کو فروغ دینے والوں اور نفرت کے سوداگروں کو اپنا کام کرنے کا ایک اچھا موقع مل گیا۔

مستقبل شناس قائد سید مودودی رحمہ اللہ نے مستقبل کے حالات کا اندازہ کرتے ہوئے اس بات کا مشورہ دیا کہ جہاں دعوت کا کام اہم ہے، ملت کے اہلِ خرد کے اندر اعلی نصب العین کا شعور بیدار کرنا ضروری ہے، وہیں یہ بھی ضروری ہے کہ ایک داعی امت ہونے کی حیثیت سے ہم مقامی زبانوں سے لاتعلق نہ رہیں۔ یہ واضح ہونے لگا تھا کہ اب مقامی زبانوں کو فروغ حاصل ہوگا۔ تعلیم اور ادب کے میدان میں ان زبانوں کو ریاستی سرپرستی حاصل ہوگی۔ مقامی زبانوں کو فروغ حاصل ہوگا اور رفتہ رفتہ اردو سمٹتی جائے گی۔ ایسے موقع پر تحریک اسلامی کے کارکنوں کو مولانا مودودی نے اس بات کی طرف

رہنمائی کی کہ ہندوستان کی مقامی زبانیں سیکھیں، ان میں تقریری وتحریری صلاحیت پیدا کریں۔ مقامی زبانوں میں اسلامی لٹریچر کو منتقل کرنے کا کام انجام دیں۔

آج ستر سالوں کے بعد اگر ہم جائزہ لیتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ اس میدان میں ہم بہت پیچھے رہ گئے۔ بہت سی مقامی زبانوں میں ابھی تک بنیادی لٹریچر کی منتقلی کا کام نہیں ہو سکا ہے۔ ہندی زبان میں دعوتی پہلو سے نمائندگی کرنے والے افراد کی شدید قلت ہے۔ جنوبی ہند کی علاقائی زبانوں میں قابلِ قدر کام ہونے کے باوجود رفتار سست ہے۔ مقامی زبان میں مقررین کی کمی ہے۔ اہلِ قلم کی کمی ہے۔ ایسے ادباء اور شعراء کی کمی ہے جو صالح فکر کی مؤثر نمائندگی کر سکیں۔ تحریک اسلامی کے افراد کی یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ اس خلا کو پر کریں۔ جن علاقوں میں تحریکی نظام موجود ہے وہاں تحریک کی یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ ریاستی زبان میں گفتگو، مذاکرہ، مباحثہ کرنے والے افراد تیار ہوں۔ شمال مشرقی ریاستوں میں دعوتی سرگرمی کو تیز کرنے کے لیے بھی ہماری یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ وہاں کی زبانوں میں لٹریچر کی منتقلی کا کام ہو۔ یہ دعوتی جدوجہد کی توسیع کا ایک انتہائی اہم وسیلہ ہے۔

جن علاقوں میں مسلم اور غیر مسلم سماج میں لسانی فاصلہ کم ہے وہاں نسبتاً نفرت کی فضا کم پائی جاتی ہے۔ فرقہ پرست تحریکوں کو ایسے علاقوں میں نسبتاً کم کامیابی ملی ہے جبکہ ہندوستان کی بہت سی ریاستوں میں مسلم سماج اور برادرانِ وطن کے درمیان لسانی فاصلہ ہونے کی وجہ سے قربت کے مواقع بہت کم میسر ہیں اور اس سے اسلام، مسلمان اور اسلامی تحریک سے متعلق غلط فہمیوں کو پھیلنے کا زیادہ موقع ملتا ہے۔

ملک کے اندر انگریزی زبان بڑے پیمانے پر بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اس زبان میں دعوتی لٹریچر کی تیاری کی ضرورت واہمیت کو بھی اسلامی تحریک اور دعوتی میدان میں کام کرنے والے افراد سمجھتے ہیں۔ بین الاقوامی سطح پر تیار ہونے والا اسلامی لٹریچر بھی ہمارے لیے کسی حد تک معاون ثابت ہوتا ہے، لیکن علاقائی زبانوں میں کام کی توسیع کی نہ تو خاطر خواہ جدوجہد ہی پائی جاتی ہے اور نہ ہی ہم میں اس کا واقعی شعور پایا جاتا ہے۔

علاقائی زبانوں میں مہارت سے نہ صرف یہ کہ ہم دعوتی مقاصد پورے کریں گے بلکہ خود مقامی زبان کے تحفظ میں بھی اپنا کردار ادا کر سکیں گے۔ آج علاقائی تہذیب، ثقافت اور روایات پر شہری ومغربی رنگ غالب آتا جا رہا ہے، ان روایات کے ساتھ ساتھ علاقائی زبانیں بھی انگریزی کے سیلاب سے متأثر ہو رہی ہیں۔ ایسی صورت میں آبادی کا ایک معتدبہ حصہ اگر دعوتی مقاصد سے زبان کو اپنے اظہار کا ذریعہ بناتا ہے تو یہ زبان کے تحفظ میں اہلِ زبان کا تعاون بھی ہوگا اور آخر کار اس کے مثبت دعوتی اثرات بھی مرتب ہوں گے۔

● **دانش ریاض** ،مینیجنگ ڈائرکٹر معیشت پرائیویٹ لمیٹیڈ ،ممبئی، ای میل:
danishreyaz@gmail.com

ممبئی کی لوکل ٹرینوں میں اگر کبھی تو تو میں میں ہوجائے اور جھگڑنے والے ہندی بول رہے ہوں تو بہت زیادہ نوٹس نہیں لیا جاتا لیکن اگر ان میں سے کوئی مراٹھی بولنے لگے تو پھر ہندی بولنے والے کا ناطقہ بند کردیا جاتا ہے کیونکہ ٹرین میں سوار مراٹھی مانس اپنے مراٹھا بھائی کا ساتھ دیتے ہیں۔ یہ محض ممبئی کی مثال نہیں ہے بلکہ مغربی بنگال، تمل ناڈو، کیرلا اور کرناٹک وغیرہ میں بھی آپ ایسا ہی پائیں گے۔ علاقائی عصبیت کے ساتھ ہر علاقے کی زبان کی اپنی چاشنی وہاں کے مکینوں کو اپنی طرف کھینچتی ہے اور وہ وقتی طور پر ہی سہی اپنے لوگوں کا ساتھ دیتے ہیں۔

دراصل علاقائی زبانوں نے بھی مختلف حد بندیاں قائم کی ہیں۔ مغربی و مشرقی پاکستان کی تقسیم کی بنیادی وجوہات میں ایک زبان کا جھگڑا ہی تھا۔ جنوبی ہند میں پانی کے لیے جو لڑائی جاری ہے اس میں زبان اہم کردار ادا کررہی ہے۔ زبان کی بنیاد پر علاقائی حد بندیوں کی لڑائی اب سنگین صورت اختیار کرتی جارہی ہے۔

دعوت دین کے کام میں بھی علاقائی زبان کا اہم رول رہا ہے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے حالات کی نزاکت کا پہلے ہی ادراک کرلیا تھا اور اپنے متعلقین کو جن نکات پر تیار رہنے کی تلقین کی تھی اب نظروں کے سامنے ہم ان کا مشاہدہ کررہے ہیں۔ آسام میں بنگلہ دیشی کے نام پر مسلمانوں کا قتل عام آئے دن کا معمول ہے جبکہ مغربی بنگال میں پسماندگی کی ایک بنیادی وجہ وہاں کے مسلمانوں کا بنگلہ زبان میں مہارت حاصل نہ کرنا بھی ہے۔

اسلام دشمن قوتیں زبان کے جادو کا اثر جانتی ہیں یہی وجہ ہے کہ بی جے پی نے جب نریندر مودی کی انتخابی ریلیوں کا پورے ملک میں آغاز کیا تو اس بات کا بھرپور خیال رکھا گیا کہ مودی کی تقریر ان تمام زبانوں میں سنی جائے جو علاقائی زبانیں ہیں۔ حتیٰ کہ وزیر اعظم نریندر مودی جب متحدہ عرب امارات سرکاری دورہ پر گئے تو انہوں نے خیر سگالی پیغامات عربی زبان میں ٹویٹ کیے۔

بدقسمتی یہ ہے کہ جماعت اسلامی نے مولانا مودودیؒ کے خطبہ مدارس میں بیان کردہ دوسرے نکات کو جس طرح لائق خاطر نہیں سمجھا وہیں وہ زبان کے جادو سے بھی یکسر نابلد رہے اور اس ضمن میں بھی خاطر خواہ خدمات انجام نہیں دیں جن کا کہ ملک کے حالات تقاضا کررہے تھے۔

مرکزی مکتبہ اسلامی کے ذریعہ اردو زبان کی کتابوں کی طباعت و اشاعت کو بہتر سے بہتر کرنے کے لیے حکمت عملی تو ترتیب دی گئی لیکن دوسری زبان میں اسلام کے آفاقی پیغام کو منتقل کرنے کی ویسی کوششیں نہیں کی گئی جو اس کی متقاضی تھیں۔ ہاں اس حد تک تو ضرور کوشش کی گئی کہ قرآن مجید کا ترجمہ مختلف علاقائی

زبانوں میں ہوجائے لیکن میں اسے بھی دینی جذبے کے علی الرغم کمرشیل جذبے کے طور پر دیکھتا ہوں۔ کیا یہ المیہ نہیں کہ مہاراشٹر میں مراٹھی زبان کا ترجمہ تو موجود ہے لیکن مولانا کی بیشتر کتابیں مراٹھی زبان میں نہیں ہیں۔ اگر ہم مسلم اکثریتی علاقوں کو ہٹا دیں اور خالص مراٹھی علاقوں کا جائزہ لیں تو وہاں جماعت اسلامی کی اپنی کوئی شناخت دکھائی نہیں دے گی چہ جائے کہ وہ اسلام کا تعارف پیش کریں۔ حالانکہ اگر ہندی مراٹھی یا اردو مراٹھی سبھا ہی کی بنیاد رکھی جاتی تو میں سمجھتا ہوں کہ مراٹھی ادیبوں، شاعروں کے ساتھ پڑھے لکھے طبقے تک رسائی حاصل کی جاسکتی تھی اور اسلام کے آفاقی پیغام کا تعارف کرایا جاسکتا تھا۔

مراٹھی زبان میں شائع ہونے والا ہفت روزہ شودھن کتنے مراٹھی ہندوؤں تک پہنچتا ہے یہ آپ بخوبی جان سکتے ہیں اور خود اس ہفت روزہ میں کون سی معلومات دی جارہی ہیں یہ ان سے پوچھا جاسکتا ہے جنہیں مراٹھی کی شد بد ہے۔ میں نے مہاراشٹر کی مثال اس لیے دی ہے کہ یہاں کے معمولات سے کسی حد تک آگہی ہے۔ ممکن ہے دوسرے علاقوں میں صورتحال مختلف ہو اور کہیں اچھا بھی کام ہورہا ہو۔ لیکن مجموعی تأثر تو یہی ہے کہ زبان و بیان کی حد تک ہم نے اسلام کے پیغام کو مقامی زبان میں منتقل کرنے میں انتہائی کوتاہی سے کام لیا ہے۔ مختلف علاقائی زبانوں میں ہمارے پاس نہ تو ہونہار صحافی ہیں جو اپنی تحریر سے اسلام دشمن طاقتوں کا مقابلہ کرسکیں نہ ہی ایسے ادیب وفلسفی ہیں جو زبان و بیان کا جادو چلا کر اسلامی پیغام کو عام کرسکیں۔ علاقائی زبانیں تو دور رہیں ہمارے پاس تو اب ایسے انگریزی داں بھی نہیں رہے جو لیٹر ٹو ایڈیٹر کا فریضہ بھی ادا کرسکیں۔

کاش یہ ممکن ہوتا کہ جماعت اسلامی یا اسلام پسند دوست مختلف علاقوں میں علاقائی انجمنیں بناتے جس میں غیر مسلموں کو بھی شامل کیا جاتا جو مین اسٹریم علاقائی لٹریری فورم قرار پاتا۔ کیا ہی خوب ہوتا کہ صحافیوں کی ایک ایسی علاقائی انجمن ترتیب دی جاتی جس میں ہم خیال سیکولر کردار کے حامل صاحب قلم شامل ہوتے جو ہر طرح کی انتہا پسندیوں کا جواب دیتے اور قارئین کی ایسی ٹیم تیار کرتے جہاں بقائے باہم کا سبق پڑھایا جاتا۔ کیا ہی بہتر ہوتا کہ مختلف عنوانات پر ایسے تحریری وتقریری مقابلے منعقد کیے جاتے جہاں بقائے انسانیت کے ساتھ قادر مطلق کی حقانیت پر مدلل بحث ہوتی اور اسلام کے پیغام کو عام کیا جاتا۔ کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ ہم مختلف علاقائی زبانوں کے شعراء وادباء کی ایک ایسی لسٹ تیار کریں جو سماج میں مثبت تبدیلیوں کے خوگر ہوں اور انہیں اس بات کی یقین دہانی کرائیں کہ ان کے کام کو نہ صرف ان کی قوم پسند کرتی ہے بلکہ مسلمانوں کا بھی ایک بڑا طبقہ ان کی صلاحیتوں سے مستفید ہوتا ہے لہذا ان کی کوششیں لائق ستائش ہیں اور ہم اس کے قدر دان ہیں۔

مولانا مودودیؒ نے ستر برس پہلے جو مشورے دیے تھے ان پر اگر بروقت عمل آوری ہوجاتی تو آج حالات کافی مختلف ہوتے۔

●▣●

اردو تراجم قرآن پر ایک نظر (۱۷)

(مولانا محمد امانت اللہ اصلاحی کے افادات کی روشنی میں)

ڈاکٹر محی الدین غازی، ای میل:mohiuddin.ghazi@gmail.com

اس مضمون میں اس کی ضرورت نہیں محسوس کی گئی کہ قرآن مجید کے ترجمہ کا اہم اور عظیم کام کرنے والوں کی تحسین میں کچھ رقم کیا جائے کہ اتنی عظیم خدمت مختلف شخصیات کے ذریعہ جس قدر ہمت واہتمام سے انجام دی گئی، وہ محتاج بیان وستائش نہیں ہے۔

پیش نظر تحریر میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ قرآن مجید کے ترجمہ کا کام بہت ضروری مگر نازک عمل ہے، اس میں غلطی کے امکانات کو کم سے کم کرتے رہنے کی مسلسل کوشش ضروری ہے، قرآن اللہ کا کلام ہے، تاہم اس کلام کا ترجمہ ایک انسانی کوشش ہوتی ہے، جس میں غلطیوں کا امکان ہمیشہ باقی رہتا ہے، اسی لئے جو ترجمہ جتنا زیادہ مشہور ومتداول ہے اس کا بار بار گہرائی اور باریک بینی سے جائزہ لیتے رہنا بھی اسی قدر زیادہ ضروری ہے۔ اس جائزہ میں نہ کسی طرح کا احترام مانع ہونا چاہئے اور نہ کوئی نسبت حائل ہونی چاہئے، راقم کی رائے میں ہونا تو یہ چاہئے کہ ترجمہ قرآن کا کام اجتماعی طور پر اکیڈمی کی سطح پر اور متعدد بار متعدد ماہرین لغت کی نظر سے گذرنے کے بعد قابل اشاعت سمجھا جائے، اور اشاعت کے بعد بھی نظر ثانی کا کام جاری رہے۔ لیکن بوجوہ تراجم قرآن کے ساتھ ایسا اہتمام نہیں ہوسکا۔ عام طور سے ہر ترجمہ قرآن ایک انفرادی کوشش رہی ہے، اور اس لئے غلطیوں کا امکان کسی نہ کسی حد تک ہر ترجمہ میں پایا جاتا ہے۔

----

(۹۸) مدّہ اور مدّ لہ میں فرق

قرآن مجید میں فعل مـد یـمد براہ راست مفعول بہ کے ساتھ بھی آیا ہے اور حرف جر لام کے ساتھ بھی آیا ہے۔ ان دونوں اسلوبوں میں کیا فرق ہے؟ اس سلسلے میں عام طور سے علماء لغت اور مفسرین کے یہاں کوئی صراحت نہیں ملتی، بلکہ ان کے بیانات سے لگتا ہے کہ دونوں اسلوب ہم معنی ہیں، البتہ علامہ زمخشری نے اس فرق کو صراحت کے ساتھ ذکر کیا ہے، ان کے نزدیک مدا گر مفعول بہ کے ساتھ آتا ہے تو اس کے معنی بڑھانے اور اضافہ کرنے کے ہیں، اور اگر حرف جر لام کے ساتھ آتا ہے تو اس کے معنی ڈھیل دینے اور مہلت دینے کے ہیں۔ سورہ بقرۃ آیت نمبر ۱۵ر کی تفسیر میں وہ لکھتے ہیں:

ویـمـدهـم فی طغیانهم من مد الجیش و أمده اذا زاده وألحق به ما یقویه ویکثره--- علی أن الذی بمعنی أمهله انما هو مدّ له مع اللام کأملی له۔ (تفسیر الزمخشری: ۱ر۶۷)

علامہ موصوف نے جو فرق ذکر کیا ہے، قرآن مجید کے استعمالات سے اس کی بھرپور تائید ہوتی ہے۔ لیکن محسوس ہوتا ہے کہ مترجمین قرآن کے سامنے یہ فرق واضح طور سے نہیں رہا۔ ذیل میں اس کی کچھ مثالیں پیش کی جائیں گی:

(ا) اللّٰهُ يَسْتَهْزِءُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِیْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ۔ (البقرۃ:۱۵)

اس آیت کا ترجمہ کرتے ہوئے اکثر مترجمین نے یـمدهم کا ترجمہ ڈھیل دینا کیا ہے۔ کچھ مثالیں ملاحظہ ہوں:

''اللہ ان سے مذاق کر رہا ہے، وہ ان کی رسی دراز کیے جاتا ہے، اور یہ اپنی سرکشی میں اندھوں کی طرح بھٹکتے چلے جاتے ہیں''۔ (سید مودودی، صحیح ترجمہ: اللہ ان سے مذاق کر رہا ہے، وہ انہیں ان کی سرکشی میں اندھوں کی طرح بڑھنے دے رہا ہے)

''اللہ ان سے مذاق کر رہا ہے اور ان کو ان کی سرکشی میں ڈھیل دیے جارہا ہے، یہ بھٹکتے پھر رہے ہیں''۔ (امین احسن اصلاحی، صحیح ترجمہ: اللہ ان سے مذاق کر رہا ہے اور ان کو ان کی سرکشی میں بڑھائے جارہا ہے، کہ یہ بھٹکتے پھریں)

''اللہ تعالی بھی استہزا کر رہے ہیں ان کے ساتھ اور ڈھیل دیتے چلے جاتے ہیں ان کو کہ وہ اپنی سرکشی میں حیران و سرگرداں ہو رہے ہیں''۔ (اشرف علی تھانوی)

''اللہ ان سے استہزا فرماتا ہے (جیسا کہ اس کی شان کے لائق ہے) اور انہیں ڈھیل دیتا ہے کہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے رہیں''۔ (احمد رضا خان)

جبکہ بعض لوگوں نے ڈھیل دینے کے بجائے بڑھانے کا ترجمہ کیا ہے، اور یہی موزوں ترجمہ

ہے۔ کچھ مثالیں ملاحظہ ہوں:

''اللہ ہنسی کرتا ہے ان سے اور بڑھاتا ہے ان کو ان کی شرارت میں بہکے ہوئے''۔ (شاہ عبدالقادر)

''اللہ تعالی بھی ان سے مذاق کرتا ہے اور انہیں ان کی سرکشی اور بہکاوے میں اور بڑھا دیتا ہے''۔ (محمد جونا گڑھی)

علامہ زمخشری کے بیان کردہ اصول کے مطابق اس آیت میں یمدھم کا صحیح مفہوم بڑھانا ہے نا کہ ڈھیل دینا، اس کی تائید مذکورہ ذیل آیت سے بھی ہوتی ہے، جس میں فعل یمد ٹھیک اسی اسلوب میں استعمال ہوا ہے اور اس کا ترجمہ ڈھیل دینا نہیں بلکہ بڑھانا اور کھینچنا کیا گیا ہے۔

(۲) وَإِخْوَانُهُمْ يَمُدُّونَهُمْ فِي الْغَيِّ ثُمَّ لاَ يُقْصِرُونَ۔ (الاعراف:۲۰۲)

''اور جو شیطانوں کے بھائی ہیں وہ ان کو کھینچتے جاتے ہیں غلطی میں پھر وہ کمی نہیں کرتے''۔ (شاہ عبدالقادر)

''اور وہ جو شیطانوں کے بھائی ہیں شیطان انھیں گمراہی میں کھینچتے ہیں، پھر کمی نہیں کرتے''۔ (احمد رضا خان)

''اور جو ان (ناخدا ترسوں) کے بھائی ہیں وہ ان کو گمراہی میں بڑھاتے ہیں''۔ (امین احسن اصلاحی، مولانا امانت اللہ اصلاحی کے مطابق اس آیت کا صحیح ترجمہ یوں ہے: اور جو ان شیاطین کے بھائی ہیں۔ یمدونھم میں ضمیر مستتر مرفوع کا مرجع شیاطین اور ضمیر منصوب کا مرجع اخوانھم ہے، اور اخوانھم میں ضمیر مجرور کا مرجع بھی شیاطین ہے۔ جبکہ دوسری رائے بھی مفسرین کے یہاں موجود ہے اور ذیل کا شاہ ولی اللہ کا ترجمہ اسی دوسری رائے کے مطابق ہے)

''وبرادران کافران می کشند ایشاں را در گمراہی وہرگز باز نمی ایستند'' (شاہ ولی اللہ)

بہر حال جس طرح اس آیت میں تمام مترجمین نے یمدونھم کا مفہوم بڑھانا اور کھینچنا بیان کیا ہے، اسی طرح اوپر والی آیت میں بھی یہی مفہوم لینا مناسب تھا، کیونکہ دونوں آیتوں کا اسلوب بالکل یکساں ہے۔

(۳) قُلْ مَن كَانَ فِي الضَّلَالَةِ فَلْيَمْدُدْ لَهُ الرَّحْمَنُ مَدّاً۔ (مریم:۷۵)

اس تیسری آیت میں فعل مد لام حرف جر کے ساتھ آیا ہے، اور بجا طور پر مترجمین نے ترجمہ ڈھیل دینا اور رسی دراز کرنا کیا ہے۔ شاہ عبدالقادر نے کھینچنا ترجمہ کیا ہے تاہم ان کا مقصود بھی ڈھیل دینا ہی معلوم ہوتا ہے۔

''تو کہہ جوکوئی رہا بھٹکتا سو چاہئے اس کو کھینچ لے جاوے رحمٰن خوب کھینچنا'' (شاہ عبدالقادر)

''تم فرماؤ جو گمراہی میں ہو تو اسے رحمٰن خوب ڈھیل دے'' (احمد رضا خان)

''ان سے کہہ دو کہ جو لوگ گمراہی میں پڑے رہتے ہیں تو خدائے رحمان کی شان یہی ہے کہ ان کی رسی اچھی طرح دراز کرے'' (امین احسن اصلاحی)

بیشتر مترجمین نے اس آیت میں فلیمدد کا ترجمہ عام فعل مضارع کا کیا ہے، حالانکہ یہاں یہ فعل لام امر کے ساتھ استعمال ہوا ہے، اور ترجمہ میں اس کی عکاسی ہونی چاہئے تھی، یعنی ڈھیل دیتا ہے کے بجائے ڈھیل دے کہا جائے، اوپر مذکور ترجموں میں اس کی رعایت کی گئی ہے، تاہم ذیل کے ترجموں میں اس کا لحاظ نظر نہیں آتا ہے:

''آپ فرما دیجئے کہ جو لوگ گمراہی میں ہیں رحمٰن ان کو ڈھیل دیتا چلا جارہا ہے'' (اشرف علی تھانوی)

''ان سے کہو جو شخص گمراہی میں مبتلا ہوتا ہے اسے رحمان ڈھیل دیا کرتا ہے'' (سید مودودی)

''کہہ دیجئے جو گمراہی میں ہوتا اللہ رحمٰن اس کو خوب لمبی مہلت دیتا ہے'' (محمد جوناگڑھی)

''کہہ دو کہ جو شخص گمراہی میں پڑا ہوا ہے خدا اس کو آہستہ آہستہ مہلت دیئے جاتا ہے۔'' (فتح محمد جالندھری)

مفسرین نے مفہوم کے لحاظ سے دونوں صورتوں کو جائز قرار دیا ہے، سمین حلبی لکھتے ہیں:

و قوله: "فليمدد" فيه وجهان، أحدهما: أنه طلبٌ على بابه، ومعناه الدعاء۔ والثاني: لفظه لفظ الأمر، ومعناه الخبر۔ (الدرالمصون فی علوم الكتاب المكنون۔ ۷/۲۳۲)

تاہم جب قرآن مجید میں کہیں پر نَمُدُّ سادہ فعل آیا ہے اور کہیں فلیمدد لام امر کے ساتھ فعل آیا ہے، تو مفہوم چاہے جو لیا جائے لیکن ترجمہ اسی طرح ہونا چاہئے کہ اسلوب کلام کی عکاسی ہوسکے۔

(۴) كَلَّا سَنَكْتُبُ مَا يَقُولُ وَنَمُدُّ لَهُ مِنَ الْعَذَابِ مَدّاً۔ (مریم:۷۹)

اس آیت میں فعل مد کے بعد من العذاب آیا ہے، جو مفعول بہ کی جگہ پر ہے، اس طور سے یہاں بھی ڈھیل دینے کے بجائے بڑھانے کا ترجمہ درست ہوگا۔ چنانچہ عام طور سے مترجمین نے یہاں بجا طور سے بڑھانے کا ترجمہ کیا ہے۔

''ہرگز نہیں، جو کچھ یہ بکتا ہے اسے ہم لکھ لیں گے اور اس کے لئے سزا میں اور زیادہ اضافہ کریں گے'' (سید مودودی)

''یوں نہیں، ہم لکھ رکھیں گے جو کہتا ہے اور بڑھاتے جاویں گے اس کو عذاب میں لنبا'' (شاہ

عبدالقادر)

''ہرگز نہیں اب ہم لکھ رکھیں گے جو وہ کہتا ہے اور اسے خوب لمبا عذاب دیں گے'' (احمد رضا خان)

''ہرگز نہیں، یہ جو بھی کہہ رہا ہے ہم اسے ضرور لکھ لیں گے، اور اس کے لئے عذاب بڑھائے چلے جائیں گے'' (محمد جونا گڑھی)

''ہرگز نہیں جو کچھ وہ بکتا ہے ہم اس کو نوٹ کر رکھیں گے اور اس کے عذاب میں مزید اضافہ کریں گے'' (امین احسن اصلاحی)

(۹۹) لهم عذاب کا ترجمہ

لهم عذاب کی تعبیر قرآن مجید میں متعدد مقامات پر آئی ہے، اس کا ترجمہ مترجمین نے عام طور یہ کیا ہے کہ ان کے لئے عذاب ہے۔ جبکہ صاحب تفہیم نے کہیں کہیں اس کا ترجمہ کیا ہے کہ وہ عذاب کے مستحق ہیں، حالانکہ خود انہوں نے بھی اکثر و بیشتر مقامات پر دیگر مترجمین کی طرح ترجمہ کیا ہے، مثال کے لئے ذیل کی آیتیں ملاحظہ ہوں:

(۱) خَتَمَ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِهِمْ وَعَلَى سَمْعِهِمْ وَعَلَى أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ وَلَهُمْ عَذَابٌ عظِيمٌ۔(البقرۃ:۷)

''اللہ نے ان کے دلوں اور ان کے کانوں پر مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ پڑ گیا ہے۔ وہ سخت سزا کے مستحق ہیں''۔(سید مودودی)

(۲) إِنَّ الَّذِينَ يُحِبُّونَ أَن تَشِيعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِينَ آمَنُوا لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ۔(النور:۱۹)

''جو لوگ چاہتے ہیں کہ ایمان لانے والوں کے گروہ میں فحش پھیلے وہ دنیا اور آخرت میں دردناک سزا کے مستحق ہیں، اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے''۔(سید مودودی)

(۳) وَالَّذِي تَوَلَّى كِبْرَهُ مِنْهُمْ لَهُ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۔(النور:۱۱)

''اور جس شخص نے اس کی ذمہ داری کا بڑا حصہ اپنے سر لیا اس کے لئے تو عذاب الیم ہے''۔(سید مودودی)

پہلی دو آیتوں میں عذاب کے مستحق ہونے کا ترجمہ کیا گیا ہے، جبکہ تیسری آیت میں فی الواقع ان کے لیے عذاب ہونے کا ترجمہ کیا گیا ہے۔

اگر چہ لام استحقاق کا مفہوم بتانے کے لیے بھی آتا ہے، اور اس لحاظ سے استحقاق کا ترجمہ غلط نہیں

ہے،لیکن اس ترجمہ میں وعید کا مفہوم پوری شدت کے ساتھ ادا نہیں ہوتا۔کیونکہ جب یہ کہا جائے گا کہ ان کے لیے عذاب ہے،تو اس میں یہ بات بھی شامل ہوجائے گی کہ وہ اس کے مستحق ہیں،ساتھ ہی یہ بات بھی واضح رہے گی کہ ان کو اس عذاب میں ڈالا جائے گا۔جبکہ اگر کہا جائے کہ وہ عذاب کے مستحق ہیں تو یہ لازم نہیں آئے گا کہ ان کو عذاب دیا جائے گا۔اس لحاظ سے وہی ترجمہ زیادہ مناسب ہے،جو تمام مترجمین کرتے ہیں اور خود صاحب تفہیم نے اکثر جگہوں پر کیا ہے،یعنی یہ کہ استحقاق ہی نہیں بلکہ فی الواقع ان کے لیے عذاب ہے۔

(۱۰۰) أندادا کا ترجمہ

أنداد جمع ہے ندکی جس کے اصل معنی ہم سر کے ہیں،علامہ راغب اصفہانی کہتے ہیں:

ندید الشیء: مشارکه فی جوهره، وذلك ضرب من المماثلة، فان المثل یقال فی أیِّ مشارکة کانت، فکل ند مثلٌ، ولیس کل مثل ندا۔ (المفردات فی غریب القرآن، ص:۷۹۶)

قرآن مجید میں أندادا جہاں جہاں آیا ہے،اس کا ترجمہ عام طور سے ہم سر،برابر اور شریک کیا گیا ہے،یہی لفظ کا اصل مفہوم ہے،اور یہی مشرکین کی عام روش کے مطابق حال بھی ہے،کیونکہ مشرکین اللہ کے علاوہ جن کو معبود ٹھہراتے ہیں ان کو وہ اللہ کے شریک اور ہم سر کے طور پر ہی ٹھہراتے ہیں نا کہ اللہ کے مدمقابل اور اللہ کے مخالف کے طور پر۔

قرآن مجید میں أندادا کا لفظ کئی جگہ آیا ہے،اور عام طور سے تمام مترجمین اس کا ترجمہ ہم سر،برابر اور شریک کا کرتے ہیں۔البتہ بعض مترجمین کہیں کہیں مدمقابل یا مقابل کا ترجمہ بھی کردیتے ہیں،اس سے ایک تو لفظ کا مفہوم محدود ہوجاتا ہے،کیونکہ ہم سر میں جو وسعت ہے وہ مقابل میں نہیں ہے،دوسرے یہ کہ یہ لفظ مشرکین کے عام رویہ کے مطابق نہیں ہے۔قابل غور بات یہ ہے کہ جن لوگوں نے کہیں کہیں مقابل اور مدمقابل کا ترجمہ کیا ہے،انہوں نے خود اکثر جگہ ہم سر اور شریک کا ترجمہ کیا ہے۔

(۱) فَلاَ تَجْعَلُواْ لِلّهِ أَندَاداً (البقرۃ:۲۲)

''تو دوسروں کو اللہ کا مدمقابل نہ ٹھیراؤ'' (سید مودودی)

''تم اللہ کے واسطے اب تو مت ٹھیراؤ اللہ پاک کے مقابل'' (اشرف علی تھانوی)

''سو نہ ٹھیراؤ اللہ کے برابر کوئی'' (شاہ عبدالقادر)

(۲) وَمِنَ النَّاسِ مَن يَتَّخِذُ مِن دُونِ اللّهِ أَندَاداً۔(البقرۃ:۱۶۵)

''کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ کے سوا دوسروں کو اس کا ہمسر اور مدمقابل بناتے ہیں'' (سید

مودودی)

(۳) وَجَعَلُوا لِلّٰہِ أَندَاداً لِّيُضِلُّوا عَن سَبِيلِہ۔(ابراہیم:۳۰)

''اور ٹھیرائے اللہ کے مقابل کہ بہکاویں لوگوں کو اس کی راہ سے''(شاہ عبدالقادر)

''اور انہوں نے اللہ کے مقابل ٹھہرائے، تاکہ وہ لوگوں کو اللہ کے راستے سے بھٹکا دیں''(وحید الدین خان)

''اور اللہ کے کچھ ہمسر تجویز کر لئے تاکہ وہ انہیں اللہ کے راستے سے بھٹکا دیں''(سید مودودی، اس ترجمہ میں مدمقابل کے بجائے ہم سر ترجمہ کیا ہے، جو درست ہے، تاہم اس میں ایک دوسری غلطی ہے وہ یہ کہ ترجمے سے مفہوم نکلتا ہے کہ ہم سر ان کو بھٹکائیں گے جنھوں نے ہم سر بنائے، جب کہ صحیح بات یہ ہے کہ ہمسر بنانے والے بھٹکائیں گے، نا کہ وہ جنہیں ہم سر بنایا گیا، یہی درست مفہوم عام مترجمین نے اختیار کیا ہے، اور اس مفہوم کی تائید ذیل کی سورہ زمر والی آیت سے بھی ہوتی ہے، وہاں مترجم موصوف نے صحیح مفہوم اختیار کیا ہے، کیونکہ دوسرا مفہوم لینے کی اس آیت میں گنجائش نہیں ہے)

(۴) وَجَعَلَ لِلّٰہِ أَندَاداً لِّيُضِلَّ عَن سَبِيلِہِ ۔(الزمر:۸)

''اور دوسروں کو اللہ کا ہمسر ٹھیراتا ہے تاکہ اس کی راہ سے گمراہ کرے''(سید مودودی)

''اور ٹھیراوے اللہ کی برابر اوروں کو تا بہکاوے اس کی راہ سے''(شاہ عبدالقادر)

(۵) إِذْ تَأْمُرُونَنَا أَن نَّكْفُرَ بِاللّٰہِ وَنَجْعَلَ لَهُ أَندَاداً۔(سبا:۳۳)

''جب تم ہم سے کہتے تھے کہ ہم اللہ سے کفر کریں، اور دوسروں کو اس کا ہمسر ٹھیرائیں''(سید مودودی)

(۶) قُلْ أَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُونَ بِالَّذِي خَلَقَ الْأَرْضَ فِي يَوْمَيْنِ وَتَجْعَلُونَ لَهُ أَندَاداً۔(فصلت:۹)

''اے نبی ان سے کہو، کیا تم اس خدا سے کفر کرتے ہو اور دوسروں کو اس کا ہمسر ٹھیراتے ہو جس نے زمین کو دو دنوں میں بنا دیا''(سید مودودی)

شوکت کریمی کی اطفالی شاعری کی تخلیقی بنیادیں

سید راشد حامدی

ادبِ اطفال یا بچوں کے ادب کی تخلیق بچوں کا کھیل ہے نہ بچکانہ فعل، بلکہ یہ قوموں کی تہذیبی وراثت اور اعلیٰ انسانی قدروں کو آنے والی نسلوں تک منتقل کرنے کا عظیم اور غیر معمولی عمل ہے۔ بچوں کی نفسیات، اُن کی ذہنی سطح اور اُن کی معصوم وفطری دلچسپیوں کو سامنے رکھ کر انہی کے لب و لہجے اور اُن کی جیسی سادہ اور آسان زبان میں مؤثر ادب کی تخلیق کوئی آسان اور معمولی کام نہیں ہے۔ اس کے لیے تخلیق کار کو تخلیقی عمل سے گزرتے وقت بچہ بننا پڑتا ہے۔ بچوں کی نفسیات اور اُن کی ذہنی سطح پر آ کر اُن کے لیے اس طرح دلچسپیوں کا سامان فراہم کرنا کہ اُن کے اندر تعمیری جذبوں کا فروغ ہو اور وہ مستقبل میں قوم کی قیادت اور سیادت کے لیے تیار ہو سکیں، ایک ہفت خواں طے کرنے کے مترادف ہے۔ یہ پتّے کو پانی کرنے اور جگر کو لخت لخت کرنے کا عمل ہے جو ہما شُما کے بس کا روگ نہیں، لیکن المیہ یہ ہے کہ اردو ادب میں بچوں کے ادیب و شاعر کو کبھی درخورِ اعتنا نہیں سمجھا گیا نہ انھیں ادب میں اُن کا جائز مقام دیا گیا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بچوں کے ادیب و شاعر کی طرح بچوں کا ادب بھی مفقود ہوتا جا رہا ہے۔ اب نہ الطاف حسین حالی ہیں نہ اسماعیل میرٹھی، شفیع الدین نیر ہیں نہ مائل خیر آبادی۔

انگریزی، ہندی اور دوسری زندہ زبانوں میں بچوں کے لیے جو ادب تخلیق ہو رہا ہے اردو میں اُس کا عُشرِ عشیر بھی تخلیق نہیں ہو رہا ہے۔ اس کے متعدد اسباب ہو سکتے ہیں، اُن میں سب سے بڑی وجہ شاید ہندوستان سے اردو کی سمٹتی ہوئی بساط ہے۔ جب اردو پڑھنے والے بچے ہی نہیں ہیں تو ادیب و شاعر بچوں کا ادب کیوں تخلیق کریں۔ لوگوں بالخصوص بچوں کے اندر سے کتب بینی کا ختم ہوتا ہوا شوق اس کا دوسرا بڑا سبب ہے۔

لیکن ہمیں اس صورتِ حال سے مایوس ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے کہ اردو کے بیشتر مستند ادیب و شاعر ادبِ اطفال کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھتے کیونکہ ابھی حضرتِ شوکت کریمی جیسے لوگوں کا دم غنیمت ہے جو ستائش کی تمنا اور کسی صلے کی پروا کیے بغیر مسلسل اپنے خونِ جگر سے ادبِ اطفال تخلیق کرنے میں

مصروف ہیں۔ شوکت کریمی پچھلے کئی دہوں سے شعوری طور پر ادبِ اطفال کی اُس عظیم وراثت کو سنبھالنے کا اہم فریضہ انجام دینے میں ہمہ تن منہمک ہیں جس کی داغ بیل الطاف حسین حالی، اسماعیل میرٹھی، شفیع الدین نیر، مائل خیرآبادی اورافضل حسین ایم اے ایل ٹی نے ڈالی تھی۔

اس وقت کی سب سے تشویش ناک صورت حال یہ ہے کہ نئے دور کی شہری زندگی اور فلیٹ زدہ مکانیت نے پہلے بچوں سے اُن کا آنگن چھینا پھر ٹیلی ویژن، انٹرنیٹ، موبائل اور کمپیوٹر نے، جس کے مسموم اور زہرآلود اثرات اب گاؤں قصبوں تک آ پہنچے ہیں، ماں کی لوریاں اور نانی اور دادی کی زبانی سنائی جانے والی اخلاقی کہانیاں بھی چھین لیں جو بچوں کو تاعمر روشنی دکھاتی تھیں۔ رہی سہی کسر آئے دن بدلتے ہوئے نصابِ تعلیم نے پوری کردی ہے جس نے بچوں کے بستوں کا حجم اور وزن تو بڑھا دیا ہے مگر ان بستوں کے درمیان کبھی پائے جانے والے نور، ہلال، پیامِ تعلیم، کھلونا، بچوں کی دنیا اور اُمنگ جیسے رسالوں کی خوشبوؤں کو یکسر غائب کردیا ہے۔ بچے اب نہ نور پڑھتے ہیں نہ پیام تعلیم، وہ امنگ کا مطالعہ کرتے ہیں نہ ہلال کا۔ اچھی نظمیں اُن کے سامنے ہیں نہ پیارے نغمے۔ اُن کے ہاتھوں میں اب ہندی اور انگریزی کے کامکس نظر آتے ہیں جس میں غیر اخلاقی اور مخرب اخلاق جھوٹے اور بے سرو پا قصے ہوتے ہیں جو اُن کے اخلاق و کردار پر ہی برے اثرات مرتب نہیں کرتے بلکہ اُن کی متاعِ دین و دانش پر بھی شب خون مارتے ہیں۔ مکاتب اور مدارس کو چھوڑ دیا جائے تو یہ ملت اسلامیہ کے نونہالوں کی عمومی صورتِ حال ہے کہ اُن کے سامنے اسوۂ رسول ہے نہ سیرتِ اصحاب رسول، وہ حضرت ابوبکرؓ کو جانتے ہیں نہ حضرت عمرؓ کو، ان کے کانوں میں سخاوتِ حضرت عثمان غنیؓ کے قصّے پڑتے ہیں نہ انھوں نے شجاعتِ حضرت علی مرتضیٰؓ کے واقعات پڑھے ہیں۔ وہ رافع کے شوقِ شہادت کو جانتے ہیں نہ سمرہ کی راہِ حق میں جاں نثاری کو۔ درِ خیبر کس نے اکھاڑا انھیں نہیں معلوم، حضرت خالد بن ولید کون تھے، وہ واقف نہیں۔ انھیں اب سعد بن وقاصؓ، ابوعبیدہؓ، محمد بن قاسمؒ، طارق بن زیادؒ، صلاح الدین ایوبیؒ اور ٹیپو سلطانؒ کے حقیقی قصّے کون سنائے جبکہ ماں باپ، دادا دادی اور نانا نانی خود ٹیلی ویژن کے سامنے آئینہ بنے بیٹھے ہوں۔ بچوں کے اندر مثبت اور تعمیری سوچ کیسے پروان چڑھے جب بڑے ہی ان صفات سے محروم اور ان کی اہمیت سے نابلد ہوں۔

آج کے اس کمپیوٹرائزڈ دور نے بچوں کو بھی کمپیوٹرائزڈ روبوٹ بنادیا ہے۔ گھر سے اسکول، اسکول سے گھر اور گھر میں ہوم ورک کی بے تحاشا مشغولیات اور زیادہ سے زیادہ مارکس لانے کی ہوڑ نے بچوں کا بچپن ہی نہیں چھینا اُن کے اخلاق و کردار کا درپن بھی دھندلا کردیا ہے۔ اگر تھوڑا بہت وقت بچتا بھی ہے تو وہ کرکٹ کی نذر ہو جاتا ہے یا پھر موبائل، انٹرنیٹ اور ٹیلی ویژن کی بھینٹ چڑھ جاتا ہے جس میں وہ

مکّی ماؤس، ٹام اینڈ جیری، اسپائڈر مین، سپر مین اورشکتی مان کے اپی سوڈ دیکھ کر بظاہر دل بہلاتے اور ٹائم پاس کرتے ہیں مگر صحیح بات یہ ہے کہ ان غیر حقیقی کرداروں سے اُن کے اخلاق وکردار پر غلط اثرات مرتسم ہوتے رہتے ہیں۔

اب انھیں نظموں میں ابوالمجاہد زاہد ''الحمد، قل ھواللہ فرفر کہو سنادوں''، ''کے فرض ہیں وضو میں لکھ کر کہو بتادوں'' سناتے نظر آتے ہیں، نہ مائل خیر آبادی ''بھولے بھیا'' اور ''نقلی شہزادے'' کے کردار پیش کرتے ہیں۔ دسترخوان کے ادب آداب جب بڑے ہی بھول بیٹھے ہیں تو وہ

''آؤ دسترخوان بچھائیں............مل جل کر سب کھانا کھائیں............بھائی پہلے ہاتھ تو دھولو ....کھانے میں بیکار نہ بولو......بسم اللہ جو بھولا کوئی............اس نے ساری برکت کھوئی'' بچوں کو کیسے بتائیں۔ اب نونہالوں کے کانوں میں ''الف سے اللہ کو پہچان، ب سے بڑوں کا کہنا مان'' جیسی نظمیں رس گھولتی ہیں نہ اُن کے سامنے ''ایک دو تین، قائم کرو دین، تین چار پانچ، سانچ کو نہیں آنچ'' جیسی سادہ اور سرل ریاضی اور اخلاقی قدروں کا امتزاج پیش کیا جاتا ہے۔ منظر اور پس منظر سب غائب ہو چکا ہے۔ پیش نظر ہے تو بس مادّیت کی ہوڑ جس میں سب اپنا دین وایمان داؤں پر لگا چکے ہیں۔ علم کی جگہ معلومات نے لے لی ہے اور سائنس کو خدا کا درجہ دے دیا گیا ہے جس نے ملک کے بچوں بالخصوص ملت اسلامیہ کی نوزائیدہ نسلوں کو تباہ کر کے رکھ دیا ہے۔

ایسے نازک ترین دور میں جب کھوٹے سکے ''سکہ رائج الوقت'' بن گئے ہوں اور ''زرِ خالص'' بازار سے الوپ ہو چکا ہو یا اُسے کوئی زرِ خالص ماننے کو تیار نہ ہو، حضرتِ شوکت کریمی ایک نئی آن، بان اور شان کے ساتھ فکرِ سود و زیاں سے بے نیاز ''آہِ نیم شبی، گریۂ سحری اور اشکِ سحر گاہی کا سودا لیے بازارِ ادب میں آ بیٹھے ہیں۔ زمانہ اُنھیں سودائی کہے یا دیوانہ، انھیں اِس کی پروا نہیں وہ تو اس نازک دور میں فریضۂ پیغمبری ادا کرنا چاہتے ہیں، نئی نسلوں کو اسلام کا سچا شیدائی اور ملک کا ایک اچھا شہری بنانا چاہتے ہیں۔ وہ ملت کے اُس سرمایہ کو جسے ہر قوم کے مفکرین اور دانش ور مستقبل کے معمار اور قیمتی سرمایہ کہتے ہیں، ضائع ہونے سے بچانا چاہتے ہیں جسے لوگ وقتی مفادات کے لیے دیدہ و دانستہ ضائع کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔

شوکت کریمی ملت اسلامیہ کی عظمت رفتہ اور شوکت پارینہ کی بازیافت کے لیے مستقل میدانِ جہاد میں ہیں۔ انھوں نے اپنے تدریسی تجربات کو اس خوبصورتی کے ساتھ شعری قالب میں ڈھالا ہے کہ ان کے ننھے بچوں کے لبوں کی مسکراہٹ اور اُن کے دلوں کی دھڑکن بن گئے ہیں۔ انھوں نے اپنی نظموں اور غزلوں میں بچوں کی طفلانہ حرکتوں، بچکانہ شرارتوں اور معصومانہ اداؤں کو ایک مثبت، مقصدی اور تعمیری جہت دینے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے بچوں کی سادگی، اُن کے بھول پن اور اُن کے اندر پائی جانے والی

سچے پن کی خوشبو کو تہذیبی اور ثقافتی بیانیہ بنانے کی کامیاب سعی کی ہے۔ زبان و بیان کی سادگی، لہجے کی معصومیت، مضامین کی سچائی اور اس کام کے تئیں اُن کی مقصدیت اُن کی شاعری کی امتیازی خصوصیات ہیں جو انھیں دوسروں سے ممتاز کرتی ہیں اور بچوں کے ساتھ ساتھ بڑوں کی توجہات بھی اپنی جانب مبذول کراتی ہیں۔ انھوں نے ننھے منے بچوں کی نفسیات کو سامنے رکھ کر انھی کے لب و لہجے میں ایسی مؤثر نظمیں تخلیق کی ہیں جو بچوں کے اندر اعلیٰ اخلاقی صفات پروان چڑھاتی ہیں تاکہ اُن میں زندگی کی اصل روح اور اجتماعی شعور بیدار ہو سکے اور اُن کے اندر کامیاب زندگی گزارنے کے طور طریقے، ادب آداب اور آخرت میں جواب دہی کا احساس جاگزیں ہو سکے۔ انھوں نے چھوٹی چھوٹی آسان بحروں میں زندگی کی اٹل سچائیاں بیان کی ہیں تاکہ ان کے اندر ذوقِ براہیمی اور اسماعیلی آدابِ فرزندی جلا پا سکے، ان کے اندر بلال وخبیب رضی اللہ عنہم کی صفات اُجاگر ہو سکیں۔ ان کی نظموں میں بزرگوں کے احترام کا درس بھی ہے اور چھوٹوں کے ساتھ پیار اور شفقت کی تلقین بھی۔ اُس میں جذبۂ ایثار بھی ہے اور حق گوئی کا معیار بھی۔ بری صحبت سے بچنے کا مشورہ بھی ہے اور بروں کو نیکی کی راہ پر لانے کی ترغیب بھی۔ وہ چاہتے ہیں کہ اُن کی قوم کے بچے اسپائڈر مین، سپر مین، شکتی مان اور ڈوری مان جیسے تصوراتی، بے سر وپا اور غیر حقیقی کرداروں کے بجائے حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمان غنیؓ اور حضرت علیؓ کے حقیقی اور زندگی بخش کرداروں کو اپنا آئیڈیل بنائیں اور خود کو ان کے رنگ میں رنگنے کی کوشش کریں۔

میں نے بذاتِ خود بارہا ان کے تدریسی رویوں کا مشاہدہ کیا ہے۔ وہ جس طرح بچوں کو ہنستے ہنساتے، کھیلتے گدگداتے اور ہنسی ہنسی میں سنجیدہ باتیں کرتے اور سنجیدہ اور پُر مغز رازہائے زندگی کو چٹکیوں میں حل کرتے اور بچوں کو ذہن نشین کراتے دیکھا ہے وہ صرف انھی کا حصہ ہے۔ اُن کی اطفالی شاعری پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اُن کے اندر ایک معصوم سا بچہ براجمان ہے جو اُنھیں یہ سب لکھنے لکھانے پر اکساتا رہتا ہے۔

بسا اوقات شہری زندگی میں جب مجھے بچوں کے بچپن کی گم شدگی کھلنے لگتی ہے تو میں مائل خیرآبادی کا ''نقلی شہزادہ'' پڑھنے لگتا ہوں یا پھر شوکت کریمی کے ''اجالے'' اور ''سویرا'' کی کچھ خاص نظمیں گنگنانے لگتا ہوں، دھیرے دھیرے مجھے لگتا ہے کہ میں دوبارہ بچپن کی حدود میں داخل ہو گیا ہوں۔

اگر آپ بھی کبھی ایسا محسوس کریں کہ بچوں کے اندر کی معصومیت دم توڑ رہی ہے اور ان کے اندر وقت سے پہلے مادّیت کی عیاریاں اور بیماریاں جنم لے رہی ہیں تو میری مخلصانہ رائے ہے کہ آپ انھیں شوکت کریمی کی نظمیں اور سیپارے پڑھنے کے لیے دے دیں۔ ان کے اندر کا بچہ اپنی تمام تر معصومیت کے ساتھ زندہ اور توانا ہو جائے گا۔

مولانا جلیل احسن ندویؒ
(ثانوی درس گاہ سے جامعۃ الفلاح تک)

ماسٹر عبدالجلیل مرحوم، زمین رسول پور، اعظم گڑھ

(نانا مرحوم کا یہ مضمون اُن کے کاغذات میں ملا۔ اس پر تاریخ درج نہیں ہے، البتہ مضمون کے ایک جملے سے اشارہ مل رہا ہے کہ یہ اُسی سال لکھا گیا جس سال مولانا جلیل احسن ندویؒ کا انتقال ہوا، یعنی ۱۹۸۱ء میں۔ مولانا مرحوم پر بہت سے مضامین لکھے گئے، لیکن غالباً یہ آپ پر لکھا گیا سب سے پہلا مضمون ہے۔ اس کی اسی اہمیت کے پیش نظر اسے ’’حیاتِ نو‘‘ میں اشاعت کے لیے ارسال کیا جارہا ہے۔ **عبیداللہ طاہر فلاحی**)

ایم۔اے کرنے کے بعد جولائی ۱۹۵۸ء میں ثانوی درس گاہ رام پور میں عربی تعلیم حاصل کرنے کے لیے داخلہ لیا۔ میرا کلاس دو طالب علموں پر مشتمل تھا، میں اور حبیب حامد الکاف۔

پہلے روز کلاس میں گیا تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی، کیونکہ مجھے ہندوستان کی مشہور و معروف شخصیت مولانا جلیل احسن ندویؒ صاحب سے عربی پڑھنے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ کلاس میں حبیب صاحب سے میں کمزور تھا، کیونکہ وہ بی۔اے تک عربی پڑھ کر آئے تھے۔

مولانا موصوف کی چائے انصر صاحب اور رشید عثمانی صاحب بناتے تھے۔ میں پہلے دن جب مولانا کے کمرے میں گیا تو دیکھا کہ چائے کی پیالیاں گندی ہیں۔ میں انہیں صاف کرنے بڑھا تو مولانا نے منع کر دیا۔ دوسرے دن وقتِ معیّنہ سے پہلے ہی اُن کے کمرے میں پہنچ گیا اور منع کرنے کے باوجود پیالیوں کو اچھی طرح صاف کر دیا۔ دو تین روز یہ عمل جاری رہا۔ چوتھے روز موصوف نے فرمایا: ’’حبیب کچھ عربی جانتے ہیں۔ تم اُن سے کمزور ہو۔ عصر بعد مجھ سے پڑھ لیا کرو۔‘‘ اِس جملے کی حلاوت کا احساس مجھے آج بھی ہے۔ اور میں پابندی سے پڑھنے لگا۔ ششماہی امتحان تک میں حبیب صاحب سے آگے

تھا۔[نانا جان نے گفتگو کے دوران متعدد بار یہ ذکر کیا کہ حبیب حامد عبدالرحمٰن الکاف صاحب سے اُن کے دو نمبر زیادہ تھے۔عبید]

مولانا کا طریقۂ تعلیم دلکش اور فطری تھا۔ طالبِ علم کی خفیہ صلاحیتوں کو بیدار کرنے اور انہیں فطری طور پر نشو ونما دینے کے فن سے وہ بخوبی واقف تھے۔ہم کلاس میں مطالعہ کر کے جاتے ،اور اگر اُن کے بتائے ہوئے اصول ومعنی کو بھول جاتے تو پھر اُن کے مخصوص ''کیوں'' کا سامنا کرنا پڑتا جس سے ہم گھبراتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک روز کلاس میں مولانا کا ''کیوں'' اور'' کیسے'' ڈانٹ میں تبدیل ہوگیا......اور میری آنکھیں......نمناک ہوگئیں۔سوچنے لگا ایم۔اے کرنے کے بعد ڈانٹ سن رہا ہوں......لیکن دوسرے دن موصوف کی شفقت اور محبت سے لبریز آواز نے اِس احساس کو زائل کر دیا......پھر میں نے کبھی ڈانٹ سننے کا موقع نہیں دیا۔

''آج نہیں پڑھیں گے۔'' ہم موصوف کے مخصوص لہجے میں اِس جملے کو ہفتے میں ایک بار ضرور سنتے۔''کیوں مولانا؟''ہم پوچھتے۔''نزلہ اُتر آیا ہے۔''موصوف کا اپنے مخصوص انداز میں جواب ہوتا۔ (آواز میں نون غنہ کا عنصر غالب ہوتا)اور ہم اپنے کمروں میں چلے جاتے۔

حالات تو نہیں کہوں گا، بلکہ اپنی تساہلی سے چند مہینوں میں ثانوی درس گاہ چھوڑ کر گھر آ گیا۔ایک سال بعد بی۔ایڈ کرلیا......

۱۹۶۲ء میں ایک روز عصر کے وقت ڈاکٹر خلیل صاحب ناظمِ جامعہ اسلامیہ بلریا گنج نے مجھ سے مشورہ کیا کہ مولانا جلیل احسن صاحب مل رہے ہیں، بلا لیا جائے؟ میں نے بلا تأمل اثبات میں جواب دیا۔ میں جامعہ اسلامیہ بلریا گنج کی تعلیمی کمیٹی کا ممبر اور کنوینر تھا۔ مولانا موصوف چترپور(بہار) سے بلریا گنج آ گئے۔اپنے ساتھ چترپور سے کچھ عربی طالب علم بھی لائے تھے، چنانچہ عربی اول تا عربی چہارم تک درجات کھول دیے گئے۔ جامعہ اسلامیہ کا نام بدل کر جامعۃ الفلاح رکھا گیا۔ جامعہ اسلامیہ کا جو تعلیمی خاکہ ہم نے بنایا تھا، مولانا موصوف نے اُس کو موڑ کر عربی کی طرف کر دیا۔مولانا کی رائے کے خلاف جانے کی کسی میں ہمت نہ تھی۔ اِس لیے اگر میں موصوف کو جامعۃ الفلاح کی موجودہ عربی تعلیم کا بانی کہوں تو نامناسب نہ ہوگا۔ کچھ دنوں بعد موصوف کسی بنا پر جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ چلے گئے۔لیکن اپنے لگائے ہوئے پودے سے انہیں بے پناہ محبت تھی، اِس لیے انہوں نے پھر جامعۃ الفلاح آنے کی خواہش ظاہر کی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مولانا محمد عیسیٰ صاحب جامعۃ الفلاح کے ناظم تھے۔مولانا نے مولانا محمد عیسیٰ صاحب کے سامنے اپنی چند شرطیں رکھیں:

۱- چار سو روپئے ماہوار مشاہرہ لوں گا۔

۲- ایسے حالات نہ پیدا ہوں کہ مجھے جامعۃ الفلاح چھوڑنا پڑے۔ میں اب کہیں اور نہیں جانا چاہتا، اور میرے بعد میری کتابیں جامعۃ الفلاح کی ہوں گی۔

۳- اور وہی کمرہ رہنے کے لیے لوں گا جس میں پہلے رہتا تھا۔

مولانا محمد عیسیٰ صاحب نے یہ شرطیں تسلیم کرلیں اور مولانا موصوف پھر جامعۃ الفلاح آ گئے۔

وقت گذرتا رہا۔ حالات بدلتے رہے۔ میں نے شبلی انٹر کالج اعظم گڑھ میں ملازمت کرلی۔ چند برسوں بعد بچیوں کی تعلیم کی غرض سے میں بلریا گنج میں رہنے لگا۔ یہیں سے اعظم گڑھ جایا کرتا تھا۔

میری ایک بچی سلمیٰ جامعۃ الصالحات رام پور میں عربی پڑھ رہی تھی۔ میری خواہش ہوئی کہ تعطیلات میں بچیاں مولانا موصوف سے فیض حاصل کرلیں۔ موصوف سے اگست ۱۹۷۹ء میں میں نے استدعا کی، وہ راضی ہو گئے اور وقت کا تعیّن ہو گیا۔ میں اپنی بچیوں سلمیٰ اور قیّمہ، اور مولانا محمد عیسیٰ صاحب کی بچی صادقہ کو ساتھ لوا کر موصوف سے قرآن شریف کا درس لینے جانے لگا۔ مولانا کے شاگرد لڑکے تو بے شمار ہوں گے، لیکن میرا خیال ہے کہ صرف انہیں تین بچیوں کو مولانا کی شاگردی کا چند مہینوں کے لیے شرف حاصل ہوا ہے۔ قیّمہ کو تو وہ تقریباً ایک سال تک صرف اور نحو پڑھاتے رہے۔ کاپی پر لکھ کر بھیجتے اور اُس کا جواب منگا کر اصلاح کیا کرتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا کہ بچیوں کو دینی تعلیم سے مزین کرنے کا اُنہیں بڑا شوق تھا۔ خرابی صحت کے باوجود مولانا بچیوں کو قرآن شریف پابندی سے پڑھاتے تھے۔ تعطیلاتِ سرما میں موصوف کے اصرار پر بچیوں کو رام پور سے بلایا گیا اور انہوں نے قرآن شریف پڑھایا۔ اِن بچیوں کو مولانا سے جس قدر فیض یاب ہونا اللہ نے مقدر کر رکھا تھا، وہ ہوئیں۔ قرآن شریف پڑھنے پر مجھے مولانا کی عظمت کا معترف ہونا پڑا۔ اُن کا مطالعہ بڑا وسیع اور عمیق تھا۔ جہاں کہیں وہ مولانا مودودیؒ اور مولانا امین احسن اصلاحیؒ صاحب کی تفاسیر سے اختلافِ رائے رکھتے تھے تو اُسے اتنے مدلل اور مربوط انداز میں پیش کرتے کہ سامع کو اُسے تسلیم کیے بغیر چارہ نہ رہتا۔ مولانا کی تفسیر سے اکثر و بیشتر تاریخ بدل جاتی ہے۔ وہ فرماتے تھے: ''اکثر و بیشتر مفسرین پہلے تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں، پھر اُس کی روشنی میں قرآن کی تفسیر بیان کرتے ہیں۔ لیکن میں تاریخ کو قرآن کی روشنی میں معلوم کرتا ہوں اور پھر تاریخ دیکھتا ہوں، اور جو کچھ اللہ تعالیٰ نے مجھ کو علم دیا ہے اُس کی بنیاد پر نتائج اخذ کرتا ہوں اور تفسیر بیان کرتا ہوں۔''

مولانا بہت حساس تھے۔ جسمانی معذوری سے پرے اور کسی قسم کا کوئی احسان کسی کا نہیں لیتے تھے۔ اکثر معمولی معمولی باتوں پر روٹھ جاتے، لیکن جب معذرت کیجیے تو فوراً معاف کر دیتے۔ کسی کے خلاف کبھی دل میں کوئی کدورت نہیں رکھتے تھے۔ مجھ سے کبھی کبھی اعظم گڑھ سے کچھ لانے یا لے جانے کی فرمائش کیا کرتے تھے۔ پیسے پہلے بھجوا دیتے یا لانے پر قیمت فوراً دے دیتے۔ اگر نہ لینا چاہتا تو خفا

ہوجاتے۔ اِمسال اپریل میں ایک فرائی پین اور سرخ ریفل کی فرمائش کی۔ ریفل میں نے اُسی دن خرید لی، لیکن فرائی پین میں تاج کمپنی کا خریدنا چاہتا تھا، جو اعظم گڑھ میں مل نہ سکا۔ میں نے بنارس سے منگانے کے لیے ایک دوکان دار سے کہا، وہ بھی نہ آسکا۔ ایک روز مجبوراً میں نے اعظم گڑھ سے دوسری کمپنی کا خریدا۔ مولانا کے پاس کافی تاخیر سے بھیجا۔ دوسرے دن فرائی پین ایک مختصر سی تحریر کے ساتھ واپس آیا، لکھا تھا: ''اتنے دنوں کے بعد معمولی سا کام آپ نے انجام دیا۔ فرائی پین واپس ہے، اس لیے کہ ضرورت نہیں۔ مکھن بھی نہ خریدیے۔ اب تو یہ کیا کہ آپ کو کسی کام کی زحمت دینا بڑا مشکل کام ہے۔ جلیل۔'' یہ تحریر دیکھ کر مجھے بڑا دکھ ہوا۔ مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا۔ تاخیر کا سبب بتا کر معافی مانگی۔ انہوں نے معاف کردیا اور فرمایا: ''بھجوا دینا۔'' میں نے بھیج دیا اور مولانا نے رکھ لیا۔ میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔

گرما کی تعطیل میں بچیاں رام پور سے آ گئی تھیں۔ مولانا سے مل بھی چکی تھیں۔ ابھی درس کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا۔ میں ۵؍رمضان المبارک ۱۴۰۱ھ مطابق ۸؍جولائی ۱۹۸۱ء بروز چہارشنبہ منشی سہیل صاحب کے ساتھ جامعۃ الفلاح کے کیمپس میں دو بجے نمازِ ظہر پڑھنے کے لیے داخل ہوا۔ دور سے مولانا کے کمرے کے سامنے اسکوٹر اور کچھ لوگ نظر آئے۔ پیچھے سے ''السلام علیکم'' کی جانی پہچانی آواز آئی۔ ''یہ بھیڑ کیسی ہے پپّو؟'' میں نے پوچھا۔ ''مولانا جلیل احسن صاحب کا انتقال ہوگیا۔'' (اِنا للہ واِنا اِلیہ راجعون) بچے نے جواب دیا۔ میں ششدر رہ گیا۔ برآمدے میں مولانا ابواللیث صاحب اصلاحی، مولانا نظام الدین صاحب اصلاحی ودیگر احباب تشریف فرما تھے۔ میں تیزی سے مولانا کے کمرے میں پہنچا۔ فرش پر کچھ شاگرد سرنگوں بیٹھے تھے۔ لوبان کی خوشبو تھی، اور مولانا ابدی نیند سو رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ دس بج کر چالیس منٹ پر تدبر اور دیگر تفاسیر کا مطالعہ کر کے کسی نتیجے پر پہنچ کر لکھنا شروع کیا تھا کہ فوراً لیٹ گئے۔ شارق صاحب موجود تھے۔ چند ثانیے کے اندر قرآن کا یہ عظیم مفسر روزے کے ساتھ اپنے رب سے تفسیر سمجھنے چلا گیا۔ اللہ اپنے سایۂ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین۔ ۶؍رمضان المبارک مطابق ۹؍جولائی ۱۹۸۱ء کو ½ ۹ بجے صبح مولانا کے جسدِ خاکی کو سپردِ خاک کردیا گیا اور کیا بتاؤں ایک ایسی خلش اور بے چینی کا احساس ہے جس کو صفحۂ قرطاس پر لانا مشکل ہے۔

مرحوم کے کچھ غیر مطبوعہ کام ہیں۔ کچھ قرآن شریف کی تفسیر میں ہم عصر مفسرین سے الگ رائے ہے۔ کاش! مولانا مرحوم کے کسی شاگرد کو اللہ تعالیٰ یہ توفیق عطا کرتا کہ وہ انہیں مکمل کرتا، جس کی بدولت اللہ تعالیٰ اُنہیں اپنے سایۂ رحمت میں جگہ عطا فرماتا۔ [مولانا مرحوم کی ''تدبر قرآن'' پر تنقیدی آراء کا مجموعہ کتابی شکل میں جناب مولانا نعیم الدین اصلاحی صاحب کی ترتیب وتعلیق کے ساتھ ادارۂ علمیہ جامعۃ الفلاح سے ''تدبرِ قرآن پر ایک نظر'' کے نام سے ۲۰۰۶ء میں طبع ہوکر منظرِ عام پر آ گیا ہے۔ عبید] ●●

تبصراتی مضمون

تاریخ جامعۃ الفلاح

(چندوضاحتیں اور ملاحظات)

ظفر احمد الاثری، لندن

جامعہ الفلاح کی تاریخ (مرتبہ: ڈاکٹر ضیاءالدین ملک فلاحی) کے سلسلہ میں چند باتیں:

۱۔اس کتاب میں تاریخ کے ایک پہلو کو پیش کیا گیا ہے، یہ بات اپنی جگہ بالکل صحیح ہے کہ ۱۹۶۲۔ ۱۹۶۱ء کے دور میں ایک پلان اور نصاب تعلیم کی تدوین کی تمہید اور ابتدا ہوئی۔ یہ بات مسلم ہے، یہ صرف بالکل ابتدائی مرحلہ تھا اس وقت نہ افراد تھے اور نہ مادی وسائل تھے۔اور یہ بات ایک حقیقت ہے کی مادی وسائل اور افرادی قوت کے بغیر کسی تنظیم کی اٹھان اور ترقی ممکن ہی نہیں۔

اس کتاب سے تأثر ملتا ہے کہ سارا کام اور تنظیمی امور ۱۹۶۱ء سے یک لخت شروع ہو گئے۔ حالانکہ حقیقت اس سے بہت مختلف ہے۔

اس سلسلہ میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ ۱۹۶۴ء سے جامعہ کی اصل تاریخ شروع ہوتی ہے اس سے پہلے جتنے واقعات ہوئے سب کے سب تمہیدی تھے۔اس پلان اور خاکے کو پر کرنے کی تکمیل کا آغاز ۱۹۶۴ء سے ہوا، اس سے پہلے جامعہ کے پاس افرادی قوت اور مادی وسائل نہ تھے۔

چھوٹا ناگ پور کمشنری اور اس وقت جھارکھنڈ میں ایک پرفضا جگہ چتر پور قصبہ میں انیس الدین مرحوم کی نگرانی میں ایک اقامتی درسگاہ تھی، وہاں کی خوش قسمتی تھی کہ ایسے حالات رونما ہوئے کہ مولانا جلیل احسن ندوی اور مولانا محمد عنایت اللہ اسد سبحانی اور مولانا اقبال احمد اصلاحی اور مولانا محمود عالم اصلاحی یہاں آ گئے اور عربی کے درجات کھل گئے لیکن بدقسمتی ہوئی کہ دو سال کے بعد ہی یہ سلسلہ ختم ہو گیا، اس وقت اس درسگاہ کا نام جامعہ کاشف العلوم رکھا گیا تھا۔

جامعۃ الفلاح کے لیے یہ ایک اچھا موقع تھا۔ جامعہ کے منتظمین کو جب اس کا علم ہوا تو فوراً انھوں نے مولانا جلیل احسن ندوی سے ربط قائم کیا اور اس پلان کو پر کرنے کے لیے یہاں سے مولانا جلیل احسن

ندوی اور مولانا اقبال احمد اصلاحی جامعہ آ گئے اور ان کی دعوت پر لبیک کہا۔ مولانا محمد عنایت اللہ اسد سبحانی صاحب بعد میں جامعہ تشریف لائے۔ پھر طے شدہ پروگرام کے مطابق مولانا عبدالحسیب اصلاحی صاحب بھی جامعۃ الرشاد سے تشریف لے آئے۔ مولانا جلیل احسن ندوی اور مولانا عبدالحسیب اصلاحی دونوں ہی حضرات کی آمد سے جامعہ کی ترقی اور اس پلان کے بھرنے کا پروگرام شروع ہوجاتا ہے۔ اور کچھ عرصہ کے بعد ڈاکٹر خلیل احمد صاحب اپنی کوششوں سے انیس الدین مرحوم کو خط لکھ کر مولانا شہباز صاحب کو بلانے میں کامیاب ہوگئے اور یہ سب کو معلوم ہے کہ ڈاکٹر خلیل احمد صاحب براہ راست ان سے واقف نہیں تھے، اس وقت مولانا جلیل احسن صاحب اور مولانا عبدالحسیب اصلاحی صاحب اور مولانا شبیر اصلاحی صاحب سے براہ راست واقفیت کی بنیاد پر اور ان لوگوں کے مشورے ہی سے یہ مشکل کام انجام پایا ہوگا۔ مشکل اس لیے تھا کہ چتر پور سے ان کو بلانا چتر پور کی درسگاہ کو یتیم بنانا تھا اور ایسا ہی ہوا، ان کے آجانے کے بعد وہ درسگاہ اجڑ گئی۔ چنانچہ مولانا شہباز اصلاحی صاحب چتر پور سے جامعہ تشریف لے آئے اور ان کی آمد سے یہاں علم وفکر کی دنیا میں چار چاند لگ گئے، وہ مدرسہ کی ہر گتھی کو سلجھانے اور تعلیم وتربیت کے کام میں لگ گئے اور ڈاکٹر خلیل احمد کی نظامت میں مولانا جلیل احسن ندوی نے تعلیم وتربیت کا کام شروع کردیا اور مولانا عبدالحسیب اصلاحی کی صدارت میں جامعہ کا نظم ونسق بام عروج تک پہنچا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ نظم ونسق قائم کرنے اور انتظامی امور میں ید طولی رکھتے تھے۔ فوری طور پر ایک ہاسٹل کی تعمیر ہوئی جو بہت بعد میں حسن البنا کے نام سے موسوم ہوا اور اس کے بعد مسجد کی تعمیر ہوئی جو وقت کی بہت اہم ضرورت تھی اور ایک سنہرا دور شروع ہوگیا اور اس ٹیم میں اس وقت کے تمام اساتذہ شامل ہوگئے۔

یہ بات بھی نہیں بھولنی چاہیے اگر جامعۃ کاشف العلوم اور جامعۃ الرشاد سے اساتذہ اور طلبہ نہ آتے تو ۱۹۶۱ء کا پلان اور خاکہ پائے تکمیل تک نہیں پہنچتا۔ اس لیے ۱۹۶۴ء جامعہ کی تاریخ کا ایک اہم باب اور Turning point ہے۔ موجودہ تاریخ میں اس باب کو سمیٹنے کی کوشش کرنی چاہیے ورنہ تاریخ کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔

۲۔ اس تاریخ کی کتاب میں باب دوم اور سوم حذف واضافہ کے ساتھ ڈاکٹر غلام نبی تیلی کی پی ایچ ڈی کے مقالہ کا حصہ ہیں، یہ بات محل نظر ہے۔ یہ ساری تحقیق وتفتیش ان کے نقطۂ نظر پر مبنی ہے، ظاہر ہے اس میں ان کی اپنی رائے بھی شامل ہوگی، بعض ایسے امور ہوں گے جس میں انہیں مشورہ کی ضرورت ہوئی ہوگی، اس صورت میں جامعہ کے نقطۂ نظر کو کہاں تک ملحوظ رکھا ہوگا یہ کہنا مشکل ہے، ان کے مقالہ سے استفادہ کرنا ایک اچھا قدم ہوتا، لیکن جوں کا توں نقل کردینا صحت مند روایت اور درایت کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔ اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ تاریخی تسلسل کو باقی رکھنا مشکل ہوگیا ہے، یہی وجہ

ہے کہ کبھی کبھی باتوں میں تکرار اور تضاد بھی پیدا ہو گیا ہے۔

صفحہ ۷۱ رمیں دارالاقامہ اور مطبخ کے ذکر اور صفحہ ۱۵۰ رکو پڑھیے تو اندازہ ہو جائے گا، چونکہ دو مختلف قلم کاروں کی تحریر ہے اس لیے فطری بات ہے کہ ایک ہی بات کا دو جگہ جمع ہو جانا غلطی سے پاک نہیں ہوگا۔ یہ بھی دیکھنے کو ملا کہ ایک ہی نام مختلف جگہوں پر کثرت سے استعمال ہوئے اور اس کام کی انجام دہی میں برابر کے شریک اساتذہ کا ذکر نہیں ہے۔

۳۔ طریقہ تدریس کے بارے میں: جامعۃ الفلاح دوسرے اداروں سے اس اعتبار سے ممتاز ہے کہ یہاں طریقہ تعلیم اور طریقہ تدریس مختلف ہے اور اسی امتیاز کی وجہ سے اس نے اپنا مقام پیدا کیا ہے، اس موضوع کو اس تاریخ میں ذکر نہیں کیا گیا ہے یا اس کی اہمیت نہیں سمجھی گئی ہے، یہ ایسا موضوع تھا کہ اس کے بارے میں مستقل باب قائم کر کے اس کی انفرادیت، اس کے فوائد، اس کی اہمیت اور اس کے تاریخی پس منظر اور دوسرے پہلوؤں کو اجاگر کیا جاتا۔ اس خلا کو ہم نے شدت سے محسوس کیا۔

کتاب کے دوسرے مندرجات کی طرف آتے ہیں:

(الف) جمعیۃ الطلبہ کی تاریخ نامکمل ہے قلمی پرچوں کا کوئی ذکر نہیں، کوئی تفصیل نہیں، اور طلبہ کے استفادہ کے طریقہ کار پر کوئی گفتگو نہیں، ایک مستقل باب بنا کر یہ سب ذکر کیا جانا چاہیے، کیونکہ اسی میدان سے اور اسی پلیٹ فارم سے طلبہ کی صلاحیتوں کو فروغ دینے کا موقع ملتا ہے، ہم اس کو کیسے استعمال کرتے ہیں، آج کی دنیا میں اس پلیٹ فارم کی بہت اہمیت ہے، اسی پلیٹ فارم سے قوم کو لیڈر شپ ملتی ہے۔

(ب) جمعیۃ الطلبہ کی لائبریری کی تفصیل اور اس سے استفادہ کی نوعیت، اور یہ کیسے مرحلہ وار یہاں تک پہنچی۔

(ت) جامعہ کے کتب خانہ کی تاریخ مرحلہ وار اور اس سے استفادہ کی نوعیت اور کتابوں کی اجمالی تفصیل۔

(ث) انجمن طلبۂ قدیم کے قیام کی صحیح تفصیل، اور پہلے اجتماع کے تاریخ ساز فیصلے اور میٹنگ کا ذکر، تاریخ کا اہم باب ہے، حیات نو کی تفصیل۔

(ج) صفحہ ۱۱۷ میں نصاب تعلیم کے بارے میں: ۱۹۶۴ء میں ہوئی تعلیمی میٹنگ کی کوئی روداد نہیں ہے، اس سلسلہ میں مولانا عبدالحسیب اصلاحی صاحب نے پراسپکٹس تیار کیا تھا جس میں انھوں نے جدید نصاب کی اہمیت اور اس کے اغراض ومقاصد پر روشنی ڈالی تھی۔ جامعہ کے ریکارڈ میں ہوگا۔

(ح) صفحہ ۸۰ ر پر مدرسۃ الاصلاح سے نکالے گئے اساتذہ کا ذکر ہے تو کیا مولانا شہباز اصلاحی صاحب بھی وہیں تھے؟ اور مولانا شبیر احمد اصلاحی تو پورنیہ میں تھے؟ یہ تو سب ہی اصلاحی تھے۔ صرف

مولانا جلیل احسن صاحب جو نہ اصلاحی تھے اور نہ ندوی، وہاں ندوہ میں کچھ عرصہ عربی ادب سیکھنے کے لیے گئے ورنہ وہ تو سہارنپور کے جامعہ سے فارغ ہیں۔

(خ) صفحہ ۲۷ر پر ہے ۱۹۶۳ء میں عالمیت کا آغاز ہوا تھا۔ اس کا کیا مطلب ہے؟ اس وقت تو صرف عربی اول تھا۔ پھر مزید یہ ذکر کہ دارالاقامہ میں بیرونی لڑکے رہتے تھے، کوئی ریکارڈ ہے یا حوالہ؟ اگر مان بھی لیا جائے تو اس کی صورتحال وہ قطعاً نہیں جو ۱۹۶۴ء سے ہوئی جب ملک بھر سے طلبہ آنا شروع ہوئے۔ چونکہ مولانا شبیر احمد صاحب پورنیہ سے آئے تو اپنے ساتھ چند طلبہ کو ساتھ لے کر آ گئے، یہ بات اس سے بالکل مختلف ہے جو ۱۹۶۴ء سے ہوئی شروعات کی ہے۔ اور اقامتی درسگاہ کی بنیاد اسی وقت پڑی، اور ایک ہلچل پیدا ہو گئی۔

اس بات کو یاد رکھنے اور سمجھنے کی ضرورت ہے کہ ۱۹۶۴ء میں مولانا جلیل احسن ندوی کے آ جانے سے تحریک اسلامی کے بچے جوق در جوق آنا شروع ہو گئے۔ مولانا اس وقت پورے ہندوستان میں معروف اور مشہور تھے، والدین کو ان پر مکمل اعتماد تھا کہ جامعہ میں ان کی وجہ سے تعلیم وتربیت کا عمدہ انتظام ہوگا، ایک ہی سال کے عرصہ میں یوپی کے دور دراز علاقوں سے اور اسی طرح اڑیسہ، بہار، بنگال اور آسام سے طلبہ آنا شروع ہو گئے، ظاہر ہے مقامی لوگوں اور مقامی تحریک کے افراد کو کوئی نہیں جانتا تھا۔ یہ صرف ان کی شخصیت تھی جس کی وجہ سے جامعہ کے اندر اتنی تیزی کے ساتھ داخلے شروع ہو گئے کہ فوراً ایک بورڈنگ بنانے کی ضرورت پیش آ گئی۔ میں خود جب چتر پور عربی اول ختم ہونے کے بعد واپس گیا تو مولانا شہباز اصلاحی وہاں موجود تھے، انھوں نے کہا کہ یہاں تو عربی درجات ختم ہو گئے، اب تم بلریا گنج جاؤ وہاں مولانا جلیل احسن صاحب پہنچ گئے ہیں۔ ظاہر ہے یہ بات ۱۹۶۴ء کی ہے۔

اس ضمن میں دوسرا پہلو یہ ہے کہ مولانا جلیل احسن صاحب کی شخصیت اور ان کے درس وتدریس کا تجربہ، علوم القرآن کے ماہر مولانا اختر احسن اصلاحی صاحب کے تربیت یافتہ اور فکر فراہی کے نمائندہ ہونے اور ان کی اپنی بارعب شخصیت نے بلریا گنج کے مقامی لوگوں کو متأثر کیا۔ ابتدائی زمانوں میں مقامی لوگوں سے تعاون وتعلقات استوار کرنے میں ان کا بڑا ہاتھ ہے۔ ان کو بلریا گنج کی مقامی سیاست کا صحیح اندازہ تھا، ان کو لگام لگانے میں ان کا بڑا زبردست ہاتھ ہے۔ ایک چھوٹے سے گاؤں میں اچانک، آناً فاناً جامعہ کی ترقی کا تصور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اور ظاہر ہے ان کے ساتھ پوری ٹیم تھی جس میں مولانا عبد الحسیب اصلاحی صاحب، مولانا شہباز اصلاحی صاحب، مولانا شبیر اصلاحی صاحب، مولانا صغیر احسن اصلاحی صاحب اور مولانا محمد عنایت اللہ اسد سبحانی صاحب تھے، اور سب ہی تعلیم وتربیت کے میدان میں اپنی مثال آپ تھے۔

(د) **صفحہ ۶۸؍ پر** مدرسۃ الاصلاح کا ذکر۔۔۔۔۔۔۔۔ (اخراج شدہ اساتذہ) مگر جامعۃ کاشف العلوم اور جامعۃ الرشاد کا ذکر نہیں۔

(ذ) **صفحہ ۶۹؍ پر** ہے کہ فضیلت کے درجات ۱۹۶۵ء، ۱۹۶۶ء میں قائم ہوئے، پھر اس کے بعد مولانا شبیر اصلاحی صاحب کا بیان نقل کیا گیا ہے جو غیر مطبوعہ ہے، سوچنے کی بات یہ ہے کہ ۱۹۶۴ء میں عربی اول سے عربی چہارم تک تھا اور یہی درجات آگے بڑھتے رہے، اس صورت میں عالمیت اور فضیلت کے آغاز ہونے کی بات کوئی معنی نہیں رکھتی۔

(ر) **صفحہ ۱۱۶ پر** ہے کہ مولانا جلیل احسن صاحب تین طلبہ کو لے کر آئے، یہ بات صحیح نہیں۔ چتر پور سے صرف مولانا ابوالمکارم صاحب آئے اور میں۔ غلط فہمی یہ ہوئی ہے کہ مولانا ابوالمکارم صاحب کے کلاس میں دو طالب علم جامعۃ الرشاد سے آئے تھے، جناب عبدالوحید صاحب اور جناب حبیب جمالی صاحب جو مولانا حبیب اللہ صاحب کے صاحبزادے ہیں۔

صفحہ ۱۳۸؍ پر ہے کہ مولانا شبیر احمد صاحب نے ۱۹۶۲ء میں نصاب تیار کیا۔ اس کے بعد یہ لکھا ہے کہ اس نصاب سے قبل جامعہ میں مولانا عبدالحسیب صاحب نے عربی درجات کے لیے ایک عربی نصاب جاری کر رکھا تھا، مولانا شبیر صاحب نے یقیناً اس نصاب سے ضرور فائدہ اٹھایا ہوگا۔

یہ بات سب کو معلوم ہے کہ مولانا شبیر صاحب ۱۹۶۲ء میں آئے اور مولانا عبدالحسیب صاحب مستقل طور پر ۱۹۶۴ء میں آئے۔ ہاں اگر انھوں نے کوئی نصاب بنایا تھا تو اس کا ذکر تفصیل سے ہونا چاہیے تھا۔ ہمیں جو بات معلوم ہے وہ یہ ہے کہ مولانا عبدالحسیب صاحب نے آتے ہی ایک پراسپکٹس تیار کیا تھا جو ظاہر ہے مولانا جلیل احسن صاحب کے مشورہ اور انتظامیہ کے باہمی اتفاق سے طے ہوا ہوگا۔ اس لیے نصاب کے باب میں اس ابہام کو دور کرنا چاہیے۔

اس میں بنیادی بات یہ ہے کہ تمام اساتذہ مدرسۃ الاصلاح کے فارغ شدہ تھے اس لیے نصاب کم وبیش وہیں کا نصاب تھا، اس میں اضافہ جدید علوم کا کیا گیا تھا جس میں سیاسیات، معاشیات اور انگریزی کے مضامین شامل ہیں۔ اسی پراسپکٹس میں مولانا عبدالحسیب صاحب نے اس نصاب کو قدیم اور جدید کا سنگم قرار دیا تھا۔

اسی **صفحہ (۱۳۸)** پر نصاب کے بارے میں سیکولر لفظ استعمال ہوا ہے جو غلط بات ہے کبھی بھی جامعہ کا نصاب سیکولر نہیں رہا اور نہ ڈاکٹر خلیل صاحب نے اس کی طرف کوئی قدم اٹھایا۔ یہ بات ضرور ہے ڈاکٹر خلیل صاحب اپنے تعلیمی پس منظر کی وجہ سے جامعہ کے نصاب کو زیادہ سے زیادہ سے جدید علوم کی طرف لے جانا چاہتے تھے، اور یہ کشمکش اساتذہ اور انتظامیہ کے درمیان رہی ہے، جو تاریخ کا حصہ ہے۔ ●●

نایاب خطوط

ذیل میں مولانا امین احسن اصلاحی علیہ الرحمہ کے چار خطوط بنام مولانا محمد فاروق خاں صاحب اطال اللہ بقاء ہ (مترجم قرآن مجید ہندی) شامل اشاعت کیے جارہے ہیں۔ ادارہ حیات نو مولانا محمد فاروق خاں صاحب کا تہہ دل سے شکرگزار ہے کہ موصوف نے اِن خطوط کی اشاعت کے لیے حیات نو کا انتخاب فرمایا۔ توفیق خداوندی شامل حال رہی تو اس کالم کے تحت آئندہ بھی اہم اور نایاب خطوط کی اشاعت کا اہتمام کیا جاتا رہے گا۔ **(مدیر)**

(۱)

(ماہنامہ میثاق لاہور کے لیٹر ہیڈ پر)
یکم اگست ۱۹۶۴ء
مکرمی ومحبی زادلطفہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

عنایت نامہ موصول ہوا۔ اس ہمدردی اور توجہ فرمائی کے لیے دلی شکریہ قبول فرمائیے۔ جس مضمون کا خط آپ نے رقم فرمایا ہے کم وبیش اسی مضمون کے خطوط رسالہ کے دوسرے قدردانوں کی طرف سے بھی موصول ہورہے ہیں۔ میں بھی رسالے کو بند تو نہیں کرنا چاہتا لیکن اس کے خسارے سے تنگ آگیا ہوں۔ اگر آپ حضرات اس کی توسیع اشاعت کی طرف توجہ فرمائیں تو ان شاءاللہ یہ جاری رہے گا۔ جو لوگ اس کے چندے بھیجیں وہ دائرہ حمیدیہ سرائے میر اعظم گڑھ کے پتے پر بھیجیں۔

والسلام
امین احسن اصلاحی

(بخدمت گرامی جناب محمد فاروق صاحب زادلطفہ، الحسنات، رامپور۔ بھارت)

(۲)

(پوسٹ کارڈ پر، معرفت دفتر میثاق، لاہور)
۲۵/اکتوبر۱۹۶۶ء
محترمی ومکرمی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

مولانا اصلاحی مدظلہ نے آپ کا وہ خط میرے حوالے کیا ہے جس میں آپ نے مولانا کی تصنیف اسلامی ریاست کی ایک حدیث کے بارے میں وضاحت چاہی ہے۔ مجھے مذکورہ حدیث مسلم شریف کی کتاب الامارۃ کے باب فضیلۃ الامام العادل وعقوبۃ الجائر میں مل گئی ہے۔ یہ ابوبکر بن ابی شیبہ وزہیر بن حرب وابن نمیر کی روایت ہے اور اس میں کلتا یدیہ یمین الذین یعدلون کے الفاظ آتے ہیں۔ ان الفاظ کا لفظی ترجمہ یہ ہوگا کہ خدا کے دونوں ہاتھ ان لوگوں کے داہنے ہاتھ ہیں جو انصاف کرتے ہیں۔۔۔اسی کو مصنف نے محاورہ کی زبان میں یوں کہا ہے کہ ''ان کی آستینوں میں خدا کے ہاتھ ہیں''۔

امید ہے یہ وضاحت مفید مطلب رہے گی۔

والسلام
خالد مسعود

(۳)

(پوسٹ کارڈ پر، لاہور)
۸/جنوری (سال مذکور نہیں)
محترمی ومکرمی

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ

مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کو آپ کا عنایت نامہ ملا ہے۔ چونکہ مولانا کچھ عرصے سے دورانِ سر کی تکلیف میں مبتلا ہیں اس لیے آپ کو خود جواب نہیں لکھ سکے۔ حسب الحکم میں یہ خط مولانا کی جانب سے لکھ رہا ہوں۔

مولانا آپ کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ آپ نے تفسیر کا دقت نظر سے مطالعہ کیا اور اس سے فائدہ

اٹھایا۔ نیز فروگزاشتوں کی طرف توجہ دلائی۔ اس سلسلے میں پبلشرز کو آپ کا خط دکھا دیا گیا ہے۔ مولانا امید ظاہر فرماتے ہیں کہ آپ آئندہ بھی تفسیر کا بغائر نظر مطالعہ جاری رکھیں گے اور اپنے مشوروں سے مستفید کریں گے۔

مولانا کی صحت کے لیے دعا فرمائیے گا۔

والسلام

خالد مسعود

(برائے مولانا امین احسن اصلاحی)

(۴)

(پوسٹ کارڈ پر، رحمٰن پور، اچھرہ، لاہور سے)

۱۶/ اکتوبر ۱۹۶۹ء

مکرمی و محبی زاد لطفہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

عنایت نامہ موصول ہوا۔ افسوس ہے کہ مذکورہ حوالہ کے تلاش کرنے میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ نہ یہ یاد ہے کہ کتاب لکھتے وقت کیا کتابیں پیش نظر رہی ہیں۔ نہ اس زمانے کی کوئی یادداشت اب محفوظ ہے۔ ایک صاحب نے ان کتابوں کے تمام حوالے تلاش کر کے جمع کیے ہیں لیکن وہ ان دنوں معلوم نہیں کہاں ہیں۔ میں آپ کا خط اپنے رفیق خالد مسعود صاحب کے حوالہ کر رہا ہوں اگر انہیں کوئی کامیابی ہوئی تو وہ آپ کو لکھ بھیجیں گے۔ میرا حال تو یہ ہے کہ میرے پاس یہ کتابیں موجود بھی نہیں ہیں اور اگر موجود ہیں تو دوسری کتابوں کے اندر کہیں اس طرح چھپی ہوئی ہیں کہ میں نے اس وقت جب ان کو ڈھونڈنے کی کوشش کی تو کامیابی نہیں ہوئی۔

والسلام

امین احسن اصلاحی

اے خاصہ خاصان رسل......

اے خاصہ خاصان رسل کیا میں بتاؤں
امت کا تری حال میں کس منہ سے سناؤں
ہیں جرم بھی اتنے کہ میں کس کس کو گناؤں
سیلاب نہ کیوں اشک کا میں خود پہ بہاؤں
امت پہ تری موت کا سایہ سا پڑا ہے
اور اس کا سفینہ ہے کہ اب ڈوب رہا ہے

مالا جو پروئی تھی دل و جان سے تو نے
جو قافلہ تیار کیا شان سے تو نے
لڑنا تھا سکھایا جسے طوفان سے تو نے
پالا تھا جسے مدتوں ارمان سے تو نے
وہ قافلہ اب شان سے محروم ہوا ہے
اور تار بھی اس مالا کا اب ٹوٹ چکا ہے

بازو پہ بھروسا ہے، نہ اب خود پہ یقیں ہے
امت کا تری رعب ذرا سا بھی نہیں ہے
دامن میں اب اس کے نہ تو دنیا ہے، نہ دیں ہے
رات اس کی منور ہے، نہ دن اس کا حسیں ہے
اے گنبد خضرا کے مکیں، حال برا ہے
امت پہ تری آ کے برا وقت پڑا ہے

خوں رنگ ہوئی جاتی ہے اب شام کی بستی
شعلے کی طرح سرخ ہوئی شام کی مٹی
سلگی ہے وہاں ظلم و ستم کی نئی بھٹی
حد ظلم و ستم کی نہ رہی اب کوئی باقی
بے وزن و اثر ہو کے شجر ٹوٹ گیا ہے
قسمت کا ستارہ بھی کہیں روٹھ گیا ہے

اک مرسی اٹھا تھا ابھی فرعون کے گھر میں
تکرار سی بس ہونے لگی برق و شرر میں
پھر اپنے ہی کچھ آ گئے ظالم کے اثر میں
لشکر کو ہوئی مات فقط اپنے ہی گھر میں
ناکامی سے دو چار ہر اک کام ہوا ہے
امت کا تری نام یوں بدنام ہوا ہے

ہم سب کو ہے تو گرچہ دل و جان سے پیارا
توہین تری ہو، یہ نہیں ہم کو گوارا
پیغام ترا دل میں مگر کب ہے اتارا
اخلاق سے، کردار سے پیکر نہ سنوارا
ہاتھوں میں محبت کا تری اب بھی سرا ہے
دامن مگر اخلاق سے خالی ہی پڑا ہے

دورا ہے پہ اب ہم بھی کھڑے سوچ رہے ہیں
جانا تھا کدھر اور کدھر جانے لگے ہیں
رہبر ہیں، مگر راستہ خود بھول گئے ہیں
انجام سے، ہم اپنے ہی گھبرائے ہوئے ہیں
دنیا سے نہیں، ہم کو تو اب خود سے گلہ ہے
دراصل یہ ہم سب کے گناہوں کی سزا ہے
— — — — — — — — —

ملزم ہے، گنہ گار ہے، حق دار سزا ہے
یہ عاجز و درماندہ ہے، بس تم سے جڑا ہے
منڈلائی ہوئی سامنے اک موج بلا ہے
کیا ہونا ہے انجام یہ اب کھلنے لگا ہے
حالات کی لہروں سے وہ اب ہار گیا ہے
اور اپنے گناہوں کی سزا کاٹ رہا ہے

تنویر آفاقی، دہلی

نوید مسرت

(پیاری بہن ''نوال سلامت'' کے حفظ قرآن کی خوشی میں)

جو دولت ملی تم کو قرآن کی
عطا ہے یہ بس ربِ رحمان کی
یہ دولت جو ہے حفظِ قرآن کی
ہے تصدیق خالق کے پیمان کی
صداقت کی قرآں کی ہے یہ دلیل
ضرورت نہیں اور برہان کی
مری پیاری اور چھوٹی بہنا نوال !
عطا ہو تمھیں دولت ایمان کی
ہمیشہ جہاں میں رہو سرخرو
ہو حامل زمانے میں اک شان کی

ہے لازم کہ اپناؤ قرآن کو
کرو پیروی شاہِ ذیشان کی
مزین ہو اخلاقِ قرآن سے
کرو دل سے عزت ہر انسان کی
سدا یاد اُس ماں کو رکھنا بہن!
نہیں انتہا جس کے احسان کی
دعا ہے قوؔی کی خدا سے کہ تم
بنو داعیہ رب کے فرمان کی

عبد القوی عادل، علی گڑھ

تعارف وتبصرہ

کلیات حسن

شاعر: مولانا محمد حسن رضا حسن بریلوی

مرتبین: محمد افروز قادری چریا کوٹی، محمد ثاقب رضا قادری

صفحات: 443

قیمت: 170 روپے

اشاعت: 2012

ناشر: رضا اکیڈمی، ممبئی

تقسیم کار: خواجہ بک ڈپو، 419/2 مٹیا محل جامع مسجد، دہلی 6

تبصرہ: سعید اختر اعظمی

'مصطفیٰ جان رحمت پہ لاکھوں سلام' کے حوالے سے حلقۂ سخنوراں میں معتبریت حاصل کرنے والے مولانا احمد رضا خاں کی علمی وادبی خدمات جگ ظاہر ہیں۔ انھیں خدمت دین کے لیے مکمل طور پر فارغ البال بنانے اور ان کی تمام تر عائلی ذمہ داریاں اپنے سر لینے والے برادر گرامی محمد حسن رضا بریلوی کی ذات بھی کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ انھوں نے تذکرہ وسیرت نگاری اور تحقیق وتنقید کے میدان میں اپنا لوہا منوایا تو اصلاح فکر کے لیے بھی پیش پیش رہے۔ انھوں نے کشت سخن کی آبیاری اپنے خون جگر سے اس طرح کی کہ منتشر اوراق پہ بکھرے ہوئے ان کے شعری شہ پارے قلب وجگر کو حلاوت بخشتے رہتے ہیں۔

'کلیات حسن' مولانا محمد حسن رضا کے چار سخن پاروں (ذوق نعت، وسائل بخشش، صمصام حسن، قند پارسی) کی یکجائی ہے۔ ثمر فصاحت کی ضخامت کے سبب اسے کلیات کا جز نہیں بنایا جا سکا جبکہ قطعات واشعار حسن کو یکجا کرنے میں مختلف کتب کے ضمیموں سے مدد لی گئی ہے۔ 'ذوق نعت' میں ردیف وار نعتوں کے شانہ بہ شانہ خلفائے راشدین، اہل بیت، شیخ عبدالقادر جیلانی، خواجہ معین الدین چشتی اجمیری، شاہ بدیع الدین، اچھے میاں مارہروی اور مولانا فضل رسول قادری کی منقبت بھی شامل ہے۔

انھوں نے معراج کا نقشہ کھینچنے کے ساتھ شہادت امام حسین کی داستان بھی بیان کی ہے۔'وسائل بخشش'، شیخ عبدالقادر جیلانی کے کوائف واحوال اورکرامتوں کی تفصیل کو سامنے لاتا ہے۔'صمصام حسن'، تردید ندوہ کے حوالے سے فارسی مثنوی ہے جو حمد و نعت سے شروع ہو کر نبی کریم ﷺ کے حضور استغاثہ تک جا پہنچتی ہے، پھر اصل غرض وغایت سامنے آتی ہے۔'قند پارسی'میں فارسی غزلیں، قطعات ورباعیات اور متفرق اشعار کو جگہ دی گئی ہے۔کلیات سے چند اشعار بطور نمونہ ملاحظہ ہوں ۔

ہر شے سے ہیں عیاں مرے صانع کی صنعتیں
عالم سب آئینوں میں ہے آئینہ ساز کا

....

ہر سحر نغمہ مرغان نوا سنج کا شور
گونجتا ہے ترے اوصاف سے صحرا تیرا

....

آسماں گر ترے تلووں کا نظارہ کرتا
روز اک چاند تصدق میں اتارا کرتا

....

اے نظم رسالت کے چمکتے ہوئے مطلع
تو نے ہی اسے مطلع انوار بنایا

....

جو ترا ہو گیا خدا کا ہوا
جو خدا کا ہوا، ہوا تیرا

ایک صدی پہ محیط ان شعری تخلیقات کی یکجائی سہل نہ تھی جسے محمد افروز چریا کوٹی اور محمد ثاقب رضا قادری نے ارباب علم ودانش کی مدد سے ممکن کر دکھایا اور اسے قارئین تک پہنچایا۔ مداحان سخن حسن رضا کے لیے یہ تحفہ لاجواب ہے۔

مدیر کے نام

آپ کے خطوط

ابصار احمد فلاحی ندوی، بھوپال، مدھیہ پردیش

اگست کا شمارہ بدست مدیر محترم موصول ہوا۔ ''حیاتِ نو تو از اول تا آخر معیاری ہی ہوا کرتا ہے، ذلك فضل الله يؤتيه من يشاء''، پڑھ کر ایسا لگا کہ یہ جریدہ پوری امت مسلمہ کا نمائندہ ہے۔ یہاں تنگ نظری اور محدودیت کا تصور نہیں۔ اس شمارے کے تمام ہی مضامین قابل قدر ہیں۔

استاذِ محترم مولانا صباح الدین ملک صاحب کی تجویز رسمی نہیں بلکہ برسوں کے غور وفکر کا نتیجہ ہے، اللہ کرے کہ امت کے اکابر اِن تجاویز پر سنجیدگی سے غور کریں۔ خطبہ مدراس ملت اسلامیہ ہند کے لیے مشعل راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے اسے لائحہ عمل کے طور پر پیش کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ ''اردو تراجم قرآن پر ایک نظر'' کافی اہم سلسلہ ہے، مبارک باد کے مستحق ہیں جناب ڈاکٹر محی الدین غازی صاحب کہ انہوں نے بڑی عرق ریزی کے ساتھ اس کاوش کو افادہ عام کے لیے شائع کیا۔ ڈاکٹر صاحب کی تحریروں سے عموماً یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ اگر دل میں کشادگی ہو تو انسان ہر شخص سے کچھ نہ کچھ سیکھ سکتا ہے اور یہی اسلامی مزاج ہے۔ اس کے علاوہ تمام ہی مضامین مفید ہیں۔ اللہ تعالی مدیر محترم کی محنتوں کو قبول فرمائے، آمین

محمد معاذ، معاون مدیر ''ماہنامہ رفیق منزل''، نئی دہلی، maazjamia@gmail.com

عیدالاضحیٰ کی مسرتوں کے درمیان حیات نو کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ اس دفعہ سرورق پر نگاہ ڈالتے ہوئے محسوس ہوا کہ شاید محترم مدیر صاحب کی جمالیاتی حس سرد پڑ گئی ہے۔ البتہ رسالے کے مشمولات بہت ہی خوب ہیں، فالحمدللہ علی ذلک۔

بدقسمتی سے امت مسلمہ کی ایک تعداد دینی تعلیم سے کوسوں دور ہے۔ نسلی اور خاندانی مسلمان ہونے کی وجہ سے مراسم عبادت تو ادا ہو جاتے ہیں لیکن دینی شعور اور احساس ذمہ داری کی بڑی کمی محسوس ہوتی ہے۔ خاص طور سے نوجوان نسل جسے شاہین صفت ہونا چاہیے وہ خاک چھانتی پھر رہی ہے۔ محترم مدیر نے امت کو تین خانوں میں تقسیم کیا ہے۔ اور اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ دینی تعلیم کے سلسلے میں مساجد کو کلیدی کردار ادا کرنا چاہیے۔ اس سلسلے میں یہ غور کرنے کی بھی ضرورت ہے کہ مدارس اسلامیہ اور مساجد کے ائمہ امت مسلمہ کی تربیت میں ابھی تک کیونکر بڑی حد تک ناکام ثابت ہوتے رہے۔ علاوہ ازیں یہ

بات بھی غور کرنے کی ہے کہ امت کا ایک حصہ وہ بھی ہے جس کی طرف محترم مدیر نے بھی اشارہ کیا ہے جو کہ مکمل ناخواندہ ہے یعنی جو دین اور دنیا دونوں سے کورا ہے۔ امت کے پاس ایسے افراد کے لیے کیا پروگرام ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ دینی تعلیم کا حصول اور اس کی اشاعت ہم سب کی مشترکہ ذمہ داری ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے آس پاس کے ان افراد کی فہرست تیار کریں جو بالکل بھی دین سے ناواقف ہیں اور پھر انہیں بنیادی دینی تعلیم دلانے کی اپنی سطح پر کوشش کریں۔

محترم محفوظ فلاحی صاحب کا مضمون اس لحاظ سے خاصا اہم ہے کہ انہوں نے چند عملی نمونے ان عصری دانش گاہوں کے پیش کیے ہیں جہاں دینی تعلیم، عربی واسلامیات کی تعلیم کا نظم ہے۔

جناب حافظ احسان الحق فلاحی صاحب کے زمانہ طالب علمی کے احساسات دل کی گہرائیوں تک اثر انداز ہوئے۔ موصوف نے اپنے تمام ہی اساتذہ کرام کا تذکرہ مختصر اور جامع انداز میں اس طرح پیش کیا ہے کہ ہر استاذ کی انفرادیت سامنے آ گئی۔ موصوف نے یہ احساس بھی ظاہر کیا کہ ''اس وقت کا جامعہ آج کے جامعہ سے بہت مختلف تھا۔ جب میں آج کے جامعہ پر غور کرتا ہوں تو بڑا دکھ ہوتا ہے اور سوچتا ہوں کہ کیا وہ زریں عہد پھر واپس آ سکتا ہے''۔ (صفحہ ۳۵)

جناب امین الہدیٰ مرحوم کی زندگی کے حالات اور نشیب وفراز پڑھ کر بے اختیار کانوں میں یہ شعر گونجنے لگا ؎

جادہ جادہ چھوڑ جاؤ اپنی یادوں کے نقوش
آنے والے قافلوں کے رہنما بن کر چلو

اللہ تعالیٰ تحریک اسلامی کو مرحوم کا نعم البدل عطا کرے، آمین

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کا مشہور خطبہ ''خطبۂ مدراس'' ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے آب حیات کا درجہ رکھتا ہے۔ یہ وہ نسخہ ہے جس کا ہر نکتہ آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ تمام مسلمانانِ ہند کی ذمہ داری ہے کہ اس نصیحت پر جلد عمل پیرا ہو جائیں کہ یہ ان کی بقا اور فنا کا معاملہ ہے۔ اس ضمن میں محترم محی الدین غازی صاحب کی تحریر بہت فکر انگیز ہے۔ یہ نکتہ نہایت اہم ہے کہ ''خالص نظریاتی تحریکوں کی طویل بقا کے لیے انتہائی ضروری ہوتا ہے کہ بے شعور عوام کو اہل دماغ میں تبدیل کرنے کی رفتار تیز تر کر دی جائے''۔ (صفحہ ۴۸) دوسرے لفظوں میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ نظریاتی تحریکوں کا اصل کام افراد سازی کا ہے جو کہ یقیناً بہت پتہ ماری کا کام ہے۔

مولانا محمد فاروق خاں صاحب کے نام مولانا مودودی کے خطوط پڑھ کر احساس ہوا کہ علمی استفادہ بھی ایک فن ہے، جس کے ماہر الحمدللہ مولانا مدظلہ العالی بھی ہیں۔

جامعہ کے لیل ونہار

مصباح الباری فلاحی، استاذ شعبۂ اعلیٰ، جامعۃ الفلاح

جشن آزادی کی مناسبت سے جامعہ میں تقریری مسابقہ

۱۵؍اگست ۲۰۱۶ء بروز دوشنبہ ابواللیث ہال میں یوم آزادی کے موقع پر جامعہ میں طلبہ کے درمیان ''جنگ آزادی میں مسلمانوں کے کردار'' کے عنوان سے تقریری مسابقہ منعقد ہوا، مسابقہ کا آغاز فاروق عالم (عربی چہارم) کی تلاوت کلام پاک اور محمد ابراہیم خان (عربی ششم) کے ترانہ ملی سے ہوا۔

اس مسابقہ میں شاہ زیب (عربی ہفتم)، یاسر فہد (عربی دوم) اور خالد سیف اللہ (عربی سوم) نے بالترتیب اول، دوم اور سوم پوزیشن حاصل کی، پوزیشن حاصل کرنے والے طلبہ کو بالترتیب پانچ سو، تین سو اور دو سو روپے انعام دیے گئے، اور مسابقہ میں شریک دیگر طلبہ کو بھی تشجیعی انعامات سے نوازا گیا۔

حکم کے فرائض جناب مولانا اعجاز احمد قاسمی صاحب اور جناب مولانا ذکی الرحمٰن غازی فلاحی صاحب نے انجام دیے۔

اخیر میں ناظم جامعہ جناب مولانا محمد طاہر مدنی صاحب کے بدست قومی پرچم لہرایا گیا، اس موقع پر جناب مولانا نعیم الدین اصلاحی صاحب مہتمم تعلیم وتربیت اور دیگر طلبہ واساتذہ بھی موجود تھے۔

جمعیۃ الطلبہ کا افتتاحی پروگرام

۱۸؍اگست ۲۰۱۶ء بروز پنجشنبہ جمعیۃ الطلبہ کی جانب سے مشترک افتتاحی پروگرام کا انعقاد کیا گیا۔ توثیق احمد (عربی اول) نے تلاوت کلام پیش کی اور انعام الرحمٰن (عربی چہارم) نے ترانہ پڑھا۔ افتتاحی گفتگو میں مولانا اعجاز احمد قاسمی صاحب نے فرمایا کہ یہ جمعیت آپ کی ہے، اس لیے اس سے بھرپور فائدہ اٹھائیں اور اپنی صلاحیتوں کو پروان چڑھائیں۔ جامعہ نے جو سہولتیں فراہم کی ہیں ان سے مستفید ہوں۔ اس کے بعد عبداللہ عیسی (عربی پنجم) نے عربی زبان میں اور شاہ زیب (عربی ہفتم) نے اردو زبان میں تقریر پیش کی۔ اخیر میں مہتمم تعلیم وتربیت جناب مولانا نعیم الدین اصلاحی صاحب نے طلبہ کو خطاب کیا۔

نائب ناظم جامعہ کو طلبۂ جامعہ سے خطاب

۲۱؍اگست ۲۰۱۶ء بروز یکشنبہ بعد نماز عشاء جمعیۃ الطلبہ کی جانب سے نائب ناظم جامعہ جناب مولانا مقبول احمد فلاحی صاحب نے طلبہ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ نماز اسلام کا ایک بنیادی رکن ہے، نماز سے غفلت نہ برتیں، نماز کے سلسلے میں سستی اور کاہلی نہ دکھائیں۔ اگر اقامت صلوۃ مشکل ہے تو اقامت دین کا کام کیسے ہوگا، اقامت صلوۃ کے بغیر اقامت دین کا تصور ناممکن ہے۔ نمازوں کی پابندی کریں اور اپنے اندر اللہ کے سامنے جوابدہی کا احساس پیدا کریں۔

حیدرآباد سے ایک وفد کی جامعہ آمد

۲۲؍اگست ۲۰۱۶ء بروز دوشنبہ بعد نماز مغرب جامعہ کی مسجد میں حیدرآباد سے آئے ہوئے تین افراد پر مشتمل ایک وفد کا پروگرام ہوا۔ تینوں مہمانوں کا تعارف مہتمم تعلیم وتربیت جناب مولانا نعیم الدین اصلاحی صاحب نے کرایا۔ جناب عبیداللہ خاں صاحب نے اپنی گفتگو میں فرمایا کہ ہمیں دعوتی میدان میں بہت سخت محنت کی ضرورت ہے۔ امن وشانتی وقت کی اہم ضرورت ہے۔ جماعت اسلامی ہند نے اس کے لیے باقاعدہ ایک ملک گیر مہم کا آغاز کیا ہے۔ اس موقع سے ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم اسلام کی امن وآشتی سے متعلق تعلیمات کو لوگوں کے سامنے پیش کریں۔ جناب خالد باوزیر عبدالقدیر صاحب نے اپنی گفتگو میں فرمایا کہ اسلام سب کے لیے ہے اس لیے ہم غیر مسلموں تک بھی اسلام کی تعلیمات کو پہنچائیں، اس کام کے لیے حکمت اور محنت دونوں ضروری ہے۔ ہم سب لوگ آگے آئیں اور ماحول بنائیں تاکہ غیر مسلموں تک اسلام کا پیغام پہنچ سکے۔ جناب محمد الیاس صاحب نے اپنی گفتگو میں فرمایا کہ جامعۃ الفلاح بہت ہی اعلی مقاصد کے لیے قائم کیا گیا ہے، آپ یہاں سے نکلنے کے بعد اپنے مقاصد سے غافل نہ ہوں۔

امن وانسانیت مہم کے تحت نائب ناظم جامعہ کا طلبہ سے خطاب

۲۴؍اگست بروز چہارشنبہ ابواللیث ہال میں امن وانسانیت مہم کے تحت ایک پروگرام کا انعقاد عمل میں آیا۔ نائب مہتمم جناب مولانا انیس احمد فلاحی مدنی صاحب نے جماعت اسلامی کی اس ملک گیر مہم کا تعارف کراتے ہوئے فرمایا کہ ہم جس مذہب کے علمبردار ہیں وہ امن وسلامتی کا مذہب ہے، لیکن آج ملکی وعالمی سطح پر امن وسلامتی کو خطرہ لاحق ہے، یہی وجہ ہے کہ جماعت نے اس موضوع پر ایک ملک گیر مہم منانے کی ضرورت محسوس کی۔ نائب ناظم جامعہ جناب مولانا مقبول احمد فلاحی صاحب نے اپنی گفتگو میں فرمایا کہ جماعت اسلامی اس وقت امن وانسانیت مہم چلا رہی ہے، یہ ہم سب کی ضرورت ہے۔ موصوف نے فرمایا کہ جب انسان کے اندر خودغرضی آجاتی ہے تو امن وسکون ختم ہوجاتا ہے۔ جب آدمی حدود سے

تجاوز کرتا ہے تو امن وسکون ختم ہوجاتا ہے، اس ملک کا ایک طبقہ یہ چاہتا ہے کہ سارے اختیارات ہمارے پاس آجائیں اور سب لوگ ہمارے غلام بن کر رہیں۔ کچھ اونچی برادری ہیں جن کا سمجھنا ہے کہ وہ منھ سے پیدا ہوئے ہیں اس لیے وہی حکومت کے حقدار ہیں۔ لیکن اللہ کے نزدیک سب برابر ہیں، یہی وجہ ہے کہ ہم امن وانصاف کے لیے جدوجہد کررہے ہیں۔ اس مہم کا مقصد یہ ہے کہ ان لوگوں کے جو غلط منصوبے ہیں ہم ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں، آپ جہاں بھی رہیں امن کے خلاف کوئی کام نہ کریں جب آپ امن کے لیے جدوجہد کریں تو پوری دنیا آپ کے ساتھ ہوگی۔

امن وانسانیت مہم کے تحت مولانا رحمت اللہ فلاحی صاحب کا اساتذہ سے خطاب

۲۵؍اگست ۲۰۱۶ء بروز پنجشنبہ ابواللیث ہال میں اساتذہ جامعہ کا ایک پروگرام جماعت اسلامی ہند کی امن انسانیت مہم کے تحت ہوا۔ مولانا رئیس احمد فلاحی صاحب نے نظامت کے فرائض انجام دیتے ہوئے مہم کا تعارف کرایا۔

اس کے بعد جناب مولانا رحمت اللہ اثری فلاحی صاحب نے اپنی گفتگو میں فرمایا کہ جامعۃ الفلاح ایک تحریکی ادارہ ہے، جامعہ کی خوش نصیبی ہے کہ اس کو جماعت اسلامی ہند کی سرپرستی حاصل ہے۔ موصوف نے گفتگو کرتے ہوئے فرمایا کہ تقسیم ملک کے بعد ۱۹۴۸ء میں جماعت اسلامی ہند کا قیام عمل میں آیا، جس وقت ملک آزاد ہوا صرف ۲۴۰؍ارکان جماعت تھے، جن کا اجتماع الہ آباد میں ہوا تھا، اور جماعت کی تشکیل نوعمل میں آئی تھی۔ اور اس وقت ۹۷۷۵؍ارکان جماعت ہیں۔ جماعت نے یقیناً مختلف سمتوں اور جہتوں میں کام کیا ہے، جیسے دعوت کا کام، ملی مسائل کے حل کی جدوجہد، ملکی وعالمی مسائل، خدمت خلق کا کام اور معاشی میدان میں کام، میڈیا، سوشل میڈیا، پرنٹ میڈیا اور دوسرے بہت سارے میدانوں میں جماعت اسلامی کا کام جاری ہے۔ جماعت اسلامی کی امن وانسانیت کی مہم بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ ایک انسان کو ناحق قتل کرنا پوری انسانیت کا قتل ہے۔ جماعت کا کام ہمارا اپنا کام ہے۔ اس لیے آپ بھرپور اس کا تعاون کریں۔

''قربانی کی اہمیت'' اور ''عیدالاضحیٰ کا پیغام مسلمانوں کے نام'' پر جمعیۃ الطلبہ کا مسابقہ

یکم ستمبر ۲۰۱۶ء بروز پنجشنبہ ابواللیث ہال میں جمعیۃ الطلبہ کی جانب سے قربانی کی اہمیت کے عنوان سے ایک مسابقہ عربی اول تا سوم کے طلبہ کے لیے منعقد ہوا، جس کی صدارت نائب صدر شعبہ اعلیٰ جناب مولانا عبدالعظیم فلاحی صاحب نے فرمائی۔ اس مسابقہ میں محمد یاسر فہد (عربی دوم)، محمد خالد سیف اللہ (عربی سوم) اور محمد سفیان الدین (عربی دوم) نے بالترتیب اول، دوم اور سوم پوزیشن حاصل کی۔ حکم کے فرائض جناب مولانا رئیس احمد فلاحی اور جناب مولانا اخلاق احمد قاسمی صاحب انجام دیے۔ صدارتی کلمات میں مولانا عبدالعظیم فلاحی صاحب نے فرمایا کہ لائق مبارکباد ہیں وہ طلبہ جنھوں نے اس مسابقہ

میں شرکت کی، مسابقہ کامیابی کا ایک اہم زینہ ہے۔ یکم ستمبر ہی کے دن جامعہ کی مرکزی لائبریری کے ہال میں جمعیۃ الطلبہ کی جانب سے عربی چہارم سے فضیلت تک کے طلبہ کے لیے مسابقہ بعنوان ''عیدالاضحیٰ کا پیغام مسلمانوں کے نام'' منعقد ہوا، حکم کے فرائض مولانا اعجاز احمد قاسمی صاحب اور مولانا امیر فیصل فلاحی صاحب نے انجام دیے۔ اس مسابقہ میں انعام الرحمٰن (عربی چہارم)، اطہر فیروز (عربی پنجم) اور ابومعاذ (عربی پنجم) نے بالترتیب اول، دوم اور سوم پوزیشن حاصل کی۔

ایس آئی او فلاح یونٹ کی جانب سے مذاکرہ کا انعقاد

یکم ستمبر ۲۰۱۶ء بروز پنجشنبہ بعد نماز مغرب ابواللیث ہال میں ایس آئی او فلاح یونٹ کی جانب سے ''امن وانسانیت کیوں اور کیسے؟'' کے عنوان پر ایک مذاکرہ کا انعقاد عمل میں آیا۔ برادر حمزہ بن جاوید سلطان خاں فلاحی کی تلاوت سے پروگرام کا آغاز ہوا جبکہ نظامت کے فرائض برادر نبیل احمد (عربی ششم) نے انجام دیے۔ صدر حلقہ ایس آئی او یوپی مشرق جناب عارض الیاس علوی صاحب نے اپنی گفتگو میں فرمایا کہ ادھر دو سالوں میں ملک کے حالات میں تیزی کے ساتھ تبدیلی آئی ہے اور فسادات کا سلسلہ آگے بڑھا ہے، ملک کا فاشسٹ طبقہ ملک سے امن وآشتی کو ختم کر دینا چاہتا ہے۔ جناب مولانا رئیس احمد فلاحی صاحب نے فرمایا کہ امن وانسانیت یہ ہے کہ لوگ سکون سے رہیں، محفوظ رہیں، اور کوئی کسی کو نقصان نہ پہنچائے۔ جناب مولانا مطیع اللہ فلاحی صاحب نے اپنی گفتگو میں فرمایا کہ بچپن سے مسلمانوں کے خلاف بچوں کی ذہن سازی کی جارہی ہے۔ حالات اب کافی خراب ہوتے جارہے ہیں۔ اسی لیے جماعت اسلامی ہند نے فیصلہ کیا کہ اب خاموش رہنا ٹھیک نہیں ہے، ضرورت ہے کہ ملک کی تاریخ اور موجودہ صورتحال سے ملک کے عوام کو باخبر کیا جائے، جماعت اسلامی یہ بتانا چاہتی ہے کہ ملک کی سلامتی کے لیے ضروری ہے کہ ہم سب متحد ہو کر رہیں، انتشار کسی بھی صورت ملک کے لیے صحیح نہیں ہے۔ آخر میں طلبہ کے سوالات کے تشفی بخش جواب دیے گئے۔

مہتمم تعلیم وتربیت جناب مولانا نعیم الدین اصلاحی صاحب کا طلبہ سے خطاب

۴؍ستمبر بروز یکشنبہ ابواللیث ہال میں مہتمم تعلیم وتربیت جناب مولانا نعیم الدین اصلاحی کا ایک خطاب ہوا۔ آپ نے اپنی گفتگو میں فرمایا کہ پوری دنیا میں انسانیت سسک رہی ہے، عدل وانصاف کا جنازہ نکل گیا ہے۔ نائن الیون کے بعد افغانستان، عراق، سوڈان اور شام کو برباد کیا گیا اور اب ترکی کے خلاف سازشیں جاری ہیں۔ لیکن یاد رکھیں ظلم کرنے والے بھی اس وقت امن وسکون سے نہیں ہیں۔

موصوف نے طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اپنی ذمہ داری کو محسوس کریں اور جامعہ نے ان کو جو مقصد دیا ہے، اس کے مطابق اپنی زندگی کا منصوبہ بنائیں اور اس کے لیے خود کو لگادیں۔

مولانا جاوید سلطان خاں فلاحی کی جامعہ آمد

مرکزی لائبریری سے متعلق خصوصی نشست میں متعدد اہم فیصلے لیے گئے

سابق استاذ جامعہ مولانا جاوید سلطان خاں فلاحی صاحب (ریسرچ اسکالر جامعۃ الامام ریاض) کی آمد پر جامعہ کی مرکزی لائبریری سے متعلق ایک خصوصی نشست ذمہ داران جامعہ اور بعض مدعوئینِ خصوصی کی موجودگی میں ۳/ اگست ۲۰۱۶ء کو رکھی گئی، جس میں لائبریری کو مزید بہتر اور مفید بنانے کے لیے درج ذیل اہم فیصلے لیے گئے:

۱) متعین اوقات میں لائبریری میں ایک استاد مرشد و رہنما کی حیثیت سے موجود رہے گا، جو حسبِ ضرورت طلبہ کی علمی رہنمائی کرے گا۔

۲) اساتذۂ کرام کلاسوں میں طلبہ کو لائبریری سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کرنے پر ابھاریں گے اور ان کی رہنمائی کریں گے، نیز وقتاً فوقتاً اساتذہ کی رہنمائی میں طلبہ کو لائبریری لایا جائے گا اور انہیں امہات الکتب سے واقف کرایا جائے گا۔

۳) لائبریری کی ڈیجیٹل فہرست بنوائی جائے گی۔

۴) رسائل و جرائد پر خصوصی توجہ دی جائے گی، ہر سال مکمل فائل والے رسائل کی جلد سازی کرادی جائے گی، اور زائد نسخوں کو اساتذہ اور طلبہ میں تقسیم کر دیا جائے گا۔

۵) عربی چہارم تا عربی ہشتم کے طلبہ کو اسٹاک روم میں جانے کی اجازت ہوگی۔ اسٹاک روم کھولنے کے اوقات متعین کر کے طلبہ میں اعلان کر دیا جائے گا۔

۶) وقف لائبریری کو استفادے کے لیے عام کیا جائے گا، البتہ اس میں موجود گوشے کی موجودہ شکل کو باقی رکھا جائے گا۔

۷) مولانا رحمت اللہ اثری فلاحی صاحب کو مکتبہ مرکزیہ کا مشرفِ عام بنایا جا رہا ہے، لائبریری کے کاموں میں ان سے رہنمائی حاصل کی جائے گی۔

۸) جمعیۃ الطلبہ کی لائبریری کا جائزہ لے کر اس کی رپورٹ پیش کی جائے گی۔

۹) مکتبہ مرکزیہ میں سی سی کیمرہ نصب کرایا جائے گا۔

۱۰) لائبریری میں آنے والی نئی کتابوں کو کچھ مدت کے لیے ایک خاص الماری میں نمایاں جگہ رکھا جائے گا۔

۱۱) مکتبہ مرکزیہ میں ایک باکس لگایا جائے گا، جس میں طلبہ اور زائرینِ مکتبہ اپنے مشورے اور شکایات تحریر کر کے ڈال سکیں۔

۱۲) مختلف جامعات اور لائبریریوں کا سفر کر کے ان کے طریقۂ ترتیب اور تنظیمِ کتب سے استفادہ کیا جائے گا، اور مفید چیزوں کو یہاں نافذ کیا جائے گا۔

۱۳) ہر چھ ماہ پر مکتبہ مرکزیہ میں ذمہ دارانِ جامعہ کے ساتھ نشست ہوا کرے گی، جس میں کاموں کا جائزہ لیا جائے گا۔

۱۴) دارالمطالعہ اور اسٹاک روم کی اندرونی کھڑکیوں پر جالی لگائی جائے گی، تاکہ کتابوں کی حفاظت ہو سکے۔

۱۵) مکتبہ مرکزیہ میں سولر سسٹم سے لائٹ حاصل کرنے کے لیے ماہرین سے مشورہ کیا جائے گا کہ کس صلاحیت کے سسٹم سے ضرورت پوری ہو سکتی ہے اور خرچ کا تخمینہ کیا ہوگا۔

بھساول واطراف کے فلاحی برادران کی عمومی نشست

۶ر اکتوبر ۲۰۱۶ء کو بعد نماز ظہر ملت نگر مسجد بھساول ضلع جلگاؤں میں فلاحی برادران کا ایک عمومی اجلاس منعقد کیا جا رہا ہے، ان شاء اللہ۔

بھساول کے اطراف واکناف میں سکونت پذیر فلاحی برادران سے شرکت کی اپیل ہے۔ اجتماعی طعام کے بعد ٹھیک دو (2) بجے یہ اجلاس شروع ہوگا۔

مزید تفصیلات کے لیے رابطہ کریں:-

شبیر حیدر فلاحی: 09934085619

ڈاکٹر یونس فلاحی: 09860432917

(منجانب: سید عبدالرحیم فلاحی)

پلاٹ ہی پلاٹ ——— پلاٹ ہی پلاٹ ——— پلاٹ ہی پلاٹ

آشیانہ کالونی لایا ہے آپ کے لئے سنہری موقع

ابوالفضل انکلیو، شاہین باغ، جامعہ نگر کے طرز پر بسائی جانے والی
ایک مثالی بستی کا منصوبہ

REAL INVESTORS CLINIC
CHANGE YOUR LIFE WITH A PIECE OF LAND

آشیانہ کالونی

(دلیل پور نوئیڈا گوتم بدھ نگر یوپی، فرید آباد اور نوئیڈا کے بیچ واقع)
مستقبل میں منافع کمانے کا سنہری موقع

دہلی سے قریب NCR میں فری ہولڈر رہائشی پلاٹ بک کرائیں اور مستقبل میں اپنے خوابوں کا آشیانہ بنائیں
پہلے دیکھیں — اطمینان کریں — پھر خریدیں

A.B.C. اور F بلاک کی کامیاب وترقی کے بعد G بلاک کا شاندار آغاز

ترقیاتی کام زوروں پر، WDFC ریلوے کوریڈور کا کام شروع ہو چکا ہے، FNG Exp. Way (مجوزہ)
مستقبل کی سہولیات بجلی، پانی، چوڑی سڑکیں، کشادہ گلیاں، اسکول اور مساجد (بلاک وائز)
فوری قبضہ — فوری رہائش — پکی رجسٹری — داخل خارج

Ubaid Khan
9868561707 - 9911446919
ubaidasadi@gmail.com

Real Investors Clinic
A-104, Maulana Azad Road, Shaheen Bagh,
Jamia Nagar, Okhla, New Delhi -110025
www.realinvestorsclinic.com

Majid Khan
9811909461

With best Compliments from:

Dr. M. TASLEEM
B.H.M.S., Regd. No. 4372
Cell : +91-9810536348
E-mail : dr.tasleem120@gmail.com

SURAIYYA HOMEO CLINIC AND PHARMACY

161-B, Shop No.1, Main Road, Joga Bai
Near Go Mobile Shop, Okhla, New Delhi-110025
Tel.: +91-11-26984340

HAIR PROBLEM | SKIN | PILES | OTHER CHRONIC DISEASES